ہزاروں سال پہلے
ابن حنیف

ہزاروں سال پہلے

ہزاروں سال پہلے

از

ابن حنیف

مکتبہ کارواں، ایبک روڈ، انار کلی، لاہور

مطبع :- اردو پریس، میکلوڈ روڈ • لاہور
ناشر :- چودھری عبدالحمید، ایم - اے

قیمت : تین روپے، آٹھ آنے

ترتیب

انتساب

والدِ محترم

مرزا محمد حنیف بیگ صاحب کے نام

"عِشتار"

مذہب و اخلاق، رسوم و روایات اور لٹریچر کی
تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک
کہ عشتار سے متعلقہ عقائد اور پھر ان سے برآمد شدہ
نتائج کو شاملِ تاریخ نہ کر لیا جائے۔ سات ہزار
برس پہلے سومیریوں کے سیلابِ عظیم کی بابلی
روایت ہو ... مادری تہذیب کے علمبردار
قدیم زراعت کاروں کا مذہب ہو یا موجودہ
عیسائیت اور ہندو مت، عشتار کسی نہ کسی
روپ میں ہر جگہ جلوہ گر ہے۔

عشتار

طلوعِ آفتاب سے تین ساعت قبل مشرق میں اور کبھی اتنے ہی عرصے بعد تک مغربی جانب اُفق سے خاصی بلندی پر ہمارے نظامِ شمسی کا روشن ترین سیارہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ آج کل اسے ناہید، زہرہ، وینس اور ووک، کہتے ہیں۔ اب تو اسے مذہبی نقطۂ نگاہ سے کوئی اہمیت نہیں دی جا رہی لیکن ازمنۂ قدیم میں اس کا یہی رُخ سب سے اہم تھا۔ انسانی شعور جوں جوں ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے۔ اس کے ان تمام حسین تخیلات سے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں جنھیں کبھی اس کی خوش عقیدگی یا خوف و ترہیب نے جنم دیا تھا۔ آج کل کے "بدذوق" ماہرینِ فلکیات کا خیال ہے کہ زہرہ کی غیر معمولی درخشندگی محض کاربن ڈائی اوکسائڈ کے ان گھرے بادلوں کی رہینِ منت ہے جو ہر وقت اس کی سطح کو ڈھانپے رہتے ہیں، لیکن دورِ قدیم کا "خوش ذوق" اور سادہ لوح انسان اس تابندگی کو عشق و محبت کی دیوی "عشتار" کا حسن و جمال قرار دیتا تھا۔

اس سیارے کو دیکھ کر بہت کم لوگوں کو خیال آتا ہو گا کہ یہ یا زیادہ موزوں الفاظ میں اس سے متعلقہ دیوی عشتار متعدد مذاہب حتیٰ کہ موجودہ یہودیت

اور نصرانیت اور مختلف اقوام کے رسم و رواج، علم و ادب اور اخلاق و عقائد پر ہزارہا برس تک کس قدر شدّ و مد سے اثر انداز رہی ہے بلکہ آج بھی جب کہ انسان بزعمِ خود تہذیب و تمدّن اور بلوغت کی حدوں سے کہیں آگے نکل چکا ہے۔ مہذب اقوام اس سے متعلقہ عقائد و رسوم کو کسی نہ کسی شکل میں سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب و اخلاق، رسوم و روایات، اور قدیم لٹریچر کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ عشتار سے متعلقہ عقائد اور پھر ان سے برآمد شدہ نتائج کو شاملِ تاریخ نہ کر لیا جائے۔ سات ہزار برس پہلے سومیریوں کے سیلابِ عظیم (طوفانِ نوحؑ) کی بابلی روایت ہو یا زہرہ و مشتری طوائفوں کا اپنے حُسنِ صورت سے فرشتوں کا ' ایمان، متزلزل کر کے آسمان پر چلے جانے کی پُر لطف حکایت' مادری تہذیب کے علمبردار قدیم زراعت کاروں کا مذہب ہو یا موجودہ عیسائیت اور ہندو ازم ـــ عشتار کسی نہ کسی روپ میں ہر جگہ جلوہ گر ہے۔

عشتار یا مادرِ عظیم

انسان کے ذہن میں ابتداءً کوئی باقاعدہ یا واضح تصوّر نہ تھا۔ بلکہ توہم و شگون پرستی اس کا شعار تھی۔ جب اُسے نسبتاً معاشی آسانیاں حاصل ہوئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن کچھ پختہ ہو چلا تو اُس نے اپنے لیئے ایک معبود کا دھندلا سا تصوّر قائم کیا اور یہ اوّلین معبودِ انسانی ایک دیوی تھی۔ کسی دیوتا کی بجائے دیوی کی جانب ذہنِ انسانی ملتفت ہونے کی وجہ اصل میں یہ تھی، اس کی اکثر

بنیادی ضرورتیں زمین سے پوری ہوتی تھیں اور زمین بھی اس کے لیئے آغوشِ مادر کی طرح ایک گہوارۂ آسائش ہی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ اسے مادرِ عظیم سمجھتے تھے۔

اس مادرِ عظیم کی تخلیق کب اور کہاں ہوئی اس کے متعلق فی الحال حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ قدیم عہد حجریہ، یعنی چار لاکھ برس قبل سے لے کر پچاس ہزار سال پہلے تک کے طویل دور کے کسی حصے میں انسان کو اس مادرِ کائنات کا خیال آیا ۔۔۔ بعد کے زمانوں کے اورگنیشی اور کرومیگنان[1] نسل کے نگاریوں کے ہاں اس کی پرستش کے واضح آثار مل رہے ہیں اور قدیم ترین انسان اپنی جو باقیات چھوڑ گیا ہے، ان میں اس عظیم دیوی کے مٹی کے مجسمے اور غاروں میں بنی ہوئی شکلیں بھی شامل ہیں[2]

مادرِ کل (عشتار) عراق میں

کوئی بائیس ہزار سال قبل عراق کے اولین آبادکاروں کے جانشین زراعت کاری اور دیہاتی نظام کے ابتدائی دور سے گزر رہے تھے۔ عورت چوں کہ شروع سے ہی غذائی نباتات جمع کرتی چلی آرہی تھی اس لیئے خودرو پودوں کی نگہداشت کرتے کرتے گندم کی افادیت بھی اسی نے معلوم کرلی

---

[1] کرومیگنان نسل کے لوگ کوئی تیس ہزار سال پہلے شمالی افریقہ سے یورپ میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ دُنیا کے سب سے پہلے آرٹسٹ ہیں۔ غاروں میں ان کی بنائی ہوئی بے شمار تصویریں ملتی ہیں[2]

اس طرح عورت ہی کے ہاتھوں سب سے پہلے عراق میں زراعت کی ابتدا ہوئی اور عورت ہی نے انسانی زندگی میں تمدنی انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ زراعت کاری کے ساتھ ساتھ مادری تہذیب کا بھی آغاز ہوا۔

چونکہ مدنیت کے یہ اوّلین عراقی آفریدگار زندگی کا بیشتر انحصار کاشت پر ہی کیے ہوئے تھے، اس لیے جب انھوں نے ضروریاتِ زندگی اور روئیدگی کے تمام لہلہاتے سوتے شکمِ زمین سے پھوٹتے دیکھے تو رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں زمین کی اس پرورگی اور عنایت و شفقت کے لیے تشکر و امتنان اور بعد ازاں گہرے عبودیت طلب اور تقدس آمیز جذبات بیدار ہونا شروع ہوئے۔ چونکہ اس مادری نظام میں عورت زندگی کے قریباً ہر شعبے پر حاوی تھی۔ اس لیے زراعت کاروں نے اپنی تہذیب کا منبع بھی کسی غیر مرئی "مؤنث ہستی" کو ٹھرا دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ صرف مادہ یا مؤنث کے بطن سے ہی ہر ذی روح کی پیدائش کا یکساں اور لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ غرض ان جملہ وجوہات یعنی روئیدگیِ زمین، عورت کی سماجی برتری اور تولید کے مذکورہ مسلسل چکر کی رعایت سے اظہارِ عبودیت کی خاطر قدرتاً ان کے شعور نے کسی دیوتا کی بجائے عہدِ حجریہ کی اس قدیم اور موہوم سی دیوی کو باقاعدہ معبود کی شکل دے دی اور یہ عقیدہ بنا لیا کہ ایک دیوی ہے جو پوری کائنات کو کنٹرول کر رہی ہے اور یہی دیوی "منبعِ حیات" اور "مادرِ کُل" قرار پائی۔ گویا عہدِ حجریہ کے انسانوں کی 'مادرِ عظیم' اب 'مادرِ کُل' بن گئی۔ اس طرح عورت کے

سماجی تفوق اور تولید و تناسل کا حقیقی مشاہدہ اس بے مثال دیوی کی تخلیق کا بنیادی سبب بنا جس کی باقاعدہ تخلیق کوئی بیس ہزار سال پہلے عراق میں ہوئی اور جس کی ہمہ گیری اور مقبولیت کا حریف کوئی دنیاوی حریف نہ ہو سکا۔

اس دیوی کا اولین نام تو معلوم نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اُس وقت کی منفرد اور اعلیٰ حیثیت کی مالک کسی عورت کے نام پر یا اس سے ملتا جلتا ہی کوئی نام اُس کا بھی رکھا گیا ہو۔ یا پھر ایسا کوئی نام جو 'زمین' کے معنی دیتا ہو جیسا کہ بعد کے زمانوں میں اس کا ایک نام "کی" (بمعنی زمین) ملتا ہے۔

اہلِ سومیر[1] سے پہلے عراق میں ہزاروں برس تک اس دیوی کی مخصوص پوزیشن برقرار رہی۔ مسیح سے پانچ ہزار برس پیشتر 'پدری نظام' کے حامل سومیری خاص طور پر تین — رب الارباب یا عظیم خداؤں کی پرستش کر رہے تھے، آنو (رب السمٰوات)۔ انلیل (رب الارض و فضا) اور ایا (رب الآب)

---

[1] بابل یعنی دجلہ و فرات کے درمیانی دوآبے کا جنوبی حصہ "سومیر" کہلاتا تھا۔ یہاں ایک بے حد متمدن قوم بستی تھی جو سومیری کہلاتی تھی۔ انھوں نے ایران کی طرف سے آ کر پانچ چھ ہزار قبل مسیح میں وہاں شہر بسائے۔ ان کی حیثیت شہری ریاستوں کی تھی۔ عام لوگ انھیں غیر سامی قرار دیتے تھے۔ بعض کے خیال میں وہ منگولی نسل سے تھے۔ حال کے خیال میں یہ پاکستان سے ہجرت کر کے عراق گئے تھے۔

گو سومیریوں نے مادرِ کل کا رتبہ بہت گھٹا دیا تھا لیکن وہ اس کی اہمیت کو بالکل ہی ختم نہ کر سکے۔ چنانچہ اس دیوی کو اپنے سب سے بڑا خدا آنو کی بیٹی قرار دیا اور بدستور 'ربۂ تولید' سمجھتے رہے۔ ان کے خیال میں یہ آیا اور انلیل کے ساتھ تخلیقِ انسانی میں شریک اور ان دو بڑے خداؤں کی ہم رتبہ تھی۔ وہ اسے آسمانوں کی 'کنواری ملکہ' سمجھتے تھے۔ اس صورتِ حال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو عورت پر غلبہ حاصل ہو چکا تھا تاہم سوسائٹی میں عورت کا اثر و نفوذ اب بھی بہت حد تک نمایاں تھا۔

سومیریوں کے ہاں اس مادرِ مہربان کے کوئی اکتالیس صفاتی نام ملتے ہیں۔ مثلاً "نن منخ"[2] 'بمعنی مہا دیوی' یا ملکۂ عالیہ، 'نن تو' بمعنی 'خاتونِ افزائش'، نگزیِ حل دمی بمعنی 'ہر چیز کو سنوارنے والی'۔ نن ہرسج بمعنی 'ملکہ کوہسار'۔ ہشردو بمعنی 'مقدس سانپ' (ہشر... سانپ۔ دُو... مقدس) شرگم۔ بمعنی 'بل کھایا ہوا سانپ'۔ زل خرج اور نن سیانا وغیرہ۔ سومیریوں کے ہاں وہ 'بادلوں کی دیوی' تھی اور اکادی[3] اسے نن لِل (خاتونِ سحر) کہتے تھے۔

---

[1] اِیا کے معنی ہیں 'پانیوں کا گھر'۔ اِی۔ 'گھر' اور اَ۔ پانی

[2] نن۔ عورت، خاتون اور منخ کے معنی ہیں۔ بڑا یا عظیم۔ ہندی کا لفظ 'مہا' ہو سکتا ہے کہ اسی منخ یا مخ سے نکلا ہو۔

[3] اکاد یا اگدے۔ زمانہ قدیم میں بابل کا شمالی علاقہ اکاد کہلاتا تھا۔ (بقیہ بر صفحہ ۱۷)

بابل[1] کا دور جب آیا تو عراق میں ایک اور تثلیث ظاہر ہوئی جو ان تین دیوتاؤں پر مشتمل تھی۔ ’سن‘ — ’چاند دیوتا‘، ’شمش‘ — ’سورج دیوتا‘ اور ’ادد‘ یا ’رمان‘ — ’خدائے برق و باراں اور طوفان‘۔ یہ ’مادرِ کل‘ یا سومیریوں کی ’ننمخ‘، اپنی تمام سابقہ خصوصیات کے ساتھ اس تثلیث کے ساتھ بھی موجود تھی۔ لیکن اب یہ ’آیا‘ کی بجائے — ’خدائے ماہتاب یعنی سن کی بیٹی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) اس ریاست کی بنیاد مسیح سے کوئی تین ساڑھے تین ہزار برس قبل عربوں نے اپنے صحراؤں سے نکل کر ڈالی تھی۔ یہاں کا مشہور ترین فرمانروا سارغون اول ہوا ہے جس نے سومیر کو فتح کر لیا تھا۔ یہ سامی تاریخ کا سب سے پہلا عظیم بادشاہ گزرا ہے۔ اس ریاست کی سرحدیں وہاں سے شروع ہوتی تھیں جہاں دجلہ و فرات میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ بعد میں اکادیوں نے بہت حد تک سومیری تہذیب کو اپنا لیا تھا۔ اس ریاست کا خاتمہ ۱۹۷۰ ق۔م ہوا۔

[1] بابل — اکادیوں نے جس وقت سومیر پر غلبہ پایا اُس وقت بابل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہ موجودہ بغداد سے کوئی ساٹھ میل جنوب مغرب میں فرات کے بائیں کنارے پر تھا۔ بابل دراصل باب ایلی ہے جس کے معنی ہیں ’دیوتاؤں یا خداؤں کا دروازہ‘۔ رفتہ رفتہ یہ ایک عظیم الشان شہر بن گیا اور بابل کے پہلے شاہی خاندان کا دارالحکومت رہا۔ اسی خاندان کے نامور فرمانروا حمورابی نے شمالی عراق کو فتح کر کے پہلی مرتبہ عظیم الشان بابلی سلطنت کی بنیاد ڈالی — حمورابی کی موت کے پندرہ سو برس بعد تک بابل کو بے حد اہمیت حاصل رہی۔

بن گئی تھی۔ قدیم بابل میں دیوتاؤں کے چار بڑے گروپ ہوئے ہیں اور یہ چاند بیٹی جو اوّلین گروپ سے متعلق تھی۔ رفتہ رفتہ اپنی اہم خصوصیات اور مقبولیت کے سبب سب سے زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ بابلی سن اور سمش کے ساتھ مل کر وہ ان کی مشہور تثلیث اور فطرت کی تین عظیم قوتوں، چاند، سورج، اور زمین کی تکمیل کرتی تھی۔ اس دخترِ ماہتاب کا بابلی نام عشتار تھا۔ گویا پتھر کے زمانے کے شکاریوں کی نامعلوم دیوی، زراعت کاروں کی دھرتی ماتا، اور سومیریوں کی نن مخ یا ننّو اب اس نام سے پکاری جانے لگی۔

بابل میں اس کے بے شمار نام تھے۔ عشتارا، شالا، ننا، نن شار، ننّا، اُنُوتِ، زارپنیت، اِنّنا، ششروآ، ارنینی، نن جل، انتوم، دکینہ، شوح، گِلمت، ماتبو، مرزِر، ارگنتو[1]، طروورو۔

اِنینی — ملکۂ افلاک یا خاتونِ فردوس'۔ بیلیت الِانی — دیوتاؤں کی ملکہ'۔ ممّا: دیوی جس نے مٹی سے انسان بنایا'۔ بلیت — 'بیگم'۔ اِرُوا — حاملہ'۔ گوشیا 'بالیدگی کی دیوی'۔

اِن ناموں کے علاوہ بابلی اسے مندرجہ ذیل القاب سے یاد کرتے تھے۔ سِدوری — 'دوشیزہ'۔ نرترو 'سرزمینوں کی عشتار'، کردون۔ قوت کی عشتار'۔ اَربجا 'ارض و سما کی عشتار'۔ شنوسی — 'خیالوں کی عشتار'

---

[1] یہ لفظ غالباً 'ارقو' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'ہریاول'۔

بِتانمتا، جولانیوں کی عِشتار'۔ منوتم، آہ وبکا کی عِشتار، لبتو، نوحوں کی عشتار، اَلاگل کی، آتشیں عِشتار، اَکث تار نیا، چلاتی ہوئی عشتار۔
لفظ 'عشتار' کے معنی اور اس کی اصل پر خاصی لے دے ہو چکی ہے لیکن ماہرین کسی ایک خیال پر متفق نہیں ہو سکے ہیں۔
بعض کے خیال میں اس کا قدیم ترین نام عشتار نہیں بلکہ عشدار تھا۔ اکثر محققین اس لفظ کو سامی الاصل بتلاتے ہیں اور بعض 'فنی'۔ جے ہیوٹ J. Hewat نے اس کے معنی 'پہاڑ کی بیٹی' دیئے ہیں، (عش بمعنی پہاڑ۔ اور تار بمعنی بیٹی)
بابل، نینوا، کش اور اریخ وغیرہ میں اس کے عالیشان مندر تھے۔ اریخ میں اس کے مندر کو ای آنا 'قصرِ رفیع الشان'۔ نینوا میں ای مش مش 'قربان گھر' اور اربیلا میں اس کے مندر کو ای گاشن کلما 'خاتونِ جہاں کا محل' کہتے تھے۔ بابل میں اس کے دو معبد تھے ای مخ، 'قصرِ عظیم' اور ای تی گرزا 'قصرِ مقدس' اس کا ایک اور مندر ای۔ تر کلما، 'قصرِ کائنات' کہلاتا تھا۔ — بابل میں ایک دروازہ باب عشتار کے نام سے موجود تھا۔ متعدد لوگوں کے نام اس کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ مثلاً عبدِ عشرت (عشتار کا غلام) عبدِ عشتارت۔ بنی عشتارت وغیرہ —
دنیا کی پوری دیو مالا میں صرف عشتار ہی مطلق العنان اور آزاد دیوی ہے باقی جتنی بھی نامور دیویاں ہیں۔ وہ یا تو اپنے خاوندوں کا محض پرتو تھیں یا

پھر ان کو عشتار کی سی مقبولیت اور اقتدار نصیب نہ ہوا تھا۔ گو عشتار کو بھی کچھ عرصہ مختلف مقامات پر سومیری، بابلی اور اشوری دیوتاؤں یعنی انلیل، بعل مردوخ اور اشور کی محبوبہ یا بیوی کے طور پر پیش کیا جاتا رہا اور حمورابی کے بعد متعدد دیوی دیوتاؤں کو آپس میں گڈمڈ کر کے سب کا مندر بھی ایک ہی بنا دیا گیا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی عظمت اور انانیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی پرستش بدستور جداگانہ ہوتی رہی۔ مندر علیحدہ بنتے رہے۔ قدیم سومیری معبودوں میں محض دو ایسے ہیں جن کی پرستش میں کسی اور دیوی دیوتا کو شریک نہ کیا جاتا تھا۔ ایک آسمانوں کا خدا آنو اور دوسری یہ ننمنخ یا عشتار۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آنو بھی دھندلا گیا۔ صرف، چاند بیٹی کو ہی یہ خصوصیت حاصل ہے کہ سومیر، بابل اور اشوریہ وغیرہ کے ہزاروں سالہ دور میں کتنی ہی مذہبی تبدیلیوں کے باوجود اُس نے نہ صرف اپنی آزادانہ اور منفرد حیثیت کو برقرار رکھا بلکہ تمام دوسری دیویوں کی بھی اکثر خصوصیات جذب کرتی چلی گئی اور ایک وقت ایسا آگیا کہ لفظ اَلتوُ (بمعنی دیوی) ہی عشتار کا مترادف ٹھیرا۔ یعنی جب بھی کوئی اَلتوُ (دیوی) کہتا تو اُس سے اُس کی مراد عشتار ہی ہوتی تھی۔

عورتوں میں بے پناہ مقبولیت کے باعث عشتار پوجا کہیں بھی صرف مندروں تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ گھر گھر پھیل گئی تھی۔ عشتار کی تاریخ سے وادیٔ دجلہ و فرات کے ابتدائی باشندوں کے جانشینوں کی رسوم، مذہبی عقائد،

اور کسی حد تک معاشرت کی قدامت اور ارتقائی کیفیت بخوبی جانچی جا سکتی ہے۔

اُس کی بین الاقوامی مقبولیت

بابلی کلچر اُدھر تو فنیقیوں کے ذریعے فلسطین اور وہاں سے یونان وغیرہ پہنچا اور اُدھر عراق کا زرعی تمدن زراعت کاروں کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا ایران، پاکستان اور ہندوستان بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی عشتار بھی عراق سے نکل کر دُنیا کے مختلف ملکوں میں مقبولیتِ عام حاصل کرتی گئی۔ بابل سے نکل کر جب یہ دوسرے ملکوں میں پھیلنا شروع ہوئی تو گو کئی ملکوں میں اس کا نام عشتار ہی رہا۔ لیکن خود عراق اور دوسرے ملکوں میں یہ بے شمار دوسرے ناموں سے پکاری جانے لگی اور اس کے پَرتو سے متعدد نئی دیویاں پیدا ہوتی گئیں۔ وجہ ایک تو یہ کہ علاقائی ردوبدل اور لب و لہجہ کے قدرتی اختلاف کے باعث اس کے نام بھی مختلف ہو گئے جیسے عشتارتہ عشتارات، عثتار، عتار اور مصری آئسس۔ دوسرے یہ کہ لوگ اُس کی جاذبیت سے متاثر ہو کر اپنی اور دیویوں میں بھی اکثر اس کی سی خصوصیات پیدا کر لیتے تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ جہاں کہیں اس کے ماننے والوں کو سیاسی برتری حاصل ہوتی وہاں کی اکثر دیویوں کو بھی اس کی صفات سے متصف کر دیا جاتا۔

عرب میں عشتار مؤنث کی بجائے مذکر کی حیثیت سے پوجی جاتی تھی اور

وہاں اس کا نام 'عشتار' تھا۔ عربوں کے خیال میں عشتار کی ماں سورج اور باپ چاند تھا۔ وہاں اس کے اور بھی نام تھے مثلاً وَدّ (محبت کا دیوتا)، نکرہ (نفرت کا دیوتا) اور ذوکبّد وغیرہ۔ بعد کے زمانوں میں اُلاّت، الالات، اور العزّٰی جیسے نام بھی اس کے ملتے ہیں۔ قدیم عربی شاعری میں اس کا ذکر بکثرت آیا ہے۔ بعض سامی زرخیزی اور شادابی بڑھانے کی خاطر پہلوٹھا انسانی بچہ اس پر قربان کر دیتے تھے۔

متعدد علماء کا خیال ہے کہ قدیم زمانوں میں جنوبی عرب سے سامی وارد بابل ہوئے تو وہ اپنے دیوتا عشتار کو بھی ساتھ لائے اور سومیریوں کی کنواری دیوی ننّ منّخ سے مل کر وہ مؤنث ہو گئی اور عشتار نام پڑ گیا۔

مصر میں یہ تمام غیر ملکی دیویوں سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہاں اس کا نام آئسِس تھا۔ مصریوں کی مشہور زمانہ تثلیث آئسس، اوزیرس اور حورس میں یہ موجود تھی۔ اس میں یہ ماں تھی، اوزیرس شوہر تھا اور حورس بیٹا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ عالمِ ارواح میں یہ اوزیرس کے دوش بہ دوش صدارت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ طوفانِ عظیم کی مصری حکایت میں یہ ہاتھور کی حیثیت سے انسانوں کو تباہ کرتی ملتی ہے۔ وہاں اس کے متعلق ایک دلچسپ کہانی یہ مشہور تھی کہ پہلے یہ زمین پر رہا کرتی تھی۔ ایک روز اسے آسمان پر جا کر بس جانے کی سوجھی اور یہ بوڑھے دیوتا را کا خفیہ نام معلوم کیے بغیر ممکن نہ تھا چنانچہ اس نے ایک سانپ بنا کر را کو ڈسوا دیا۔ را بہت مضطرب ہوا تو اس نے زہر اُتارنے کا

وعدہ اس شرط پر کیا کہ وہ اپنا خفیہ نام بتلا دے۔ مجبوراً رآ کو بتلانا پڑا چنانچہ وہ آسمان پر جا پہنچی۔

ممفس میں اس کا ایک مندر موجود تھا۔ مصر میں یہ قشکو (ربۃ النجم) اور کدآیشہ کے ناموں سے بھی متعارف تھی۔

قدیم پاکستان میں وادیٔ سندھ کے مادری تہذیب کے علمبردار وسیع پیمانے پر مادرِ کل کی پرستش کر رہے تھے۔ پاکستان کے قدیم رسم الخط کی اجنبیت اور طویل کتبوں کے تا حال نہ مل سکنے کے سبب اس کے قدیم پاک و ہندی ناموں کا پتہ نہیں چل سکا۔ ممکن ہے کہ بابلی ناموں سے ملتا جلتا کوئی نام اس کا یہاں بھی مروّج ہو۔

جاہل اور غیر متمدن آریہ جب پاکستان آئے تو جہاں انھوں نے پاکستانیوں سے تہذیب و تمدن اور علوم فلسفہ، نجوم، طب اور ریاضی وغیرہ مستعار لیے وہیں وہ ان کے مذہب سے بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے پاکستانی زراعت کاروں سے 'مادرِ کائنات کی پرستش کے ساتھ ساتھ رشو پوجا بھی لے لی۔

آریہ اسے اوشا (ملکۂ صبح)، اوشانا، اہانا کہتے تھے۔ رگ وید میں اس کی تعریف و توصیف میں کوئی بیس بھجن آئے ہیں۔ البتہ ایک جگہ اس کا ذکر بہت ذلت آمیز پیرائے میں بھی ہوا ہے :

"اِندر — تو نے آسمان کی اس شریر اور لاف زن بیٹی — اوشا

کی سرکوبی کر کے خوب جرأت کا کام کیا ہے ۔ با جبروت دیوتا نے اس کا رتھ توڑ پھینکا ۔ اور وہ ٹوٹا رتھ چھوڑ کر لرزاں و ترساں بھاگ نکلی۔"

میڈم زیڈ۔ اے۔ راگوزن مصنفۂ ویدک ہند نے اس بھجن کی توہین آمیز عبارت پر بڑے تعجب کا ذکر کیا ہے کہ خلافِ معمول رگ وید کے شاعروں نے صرف ایک موقعہ پر اوشا کی بڑی تذلیل کی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں جب آریہ یہاں آئے تو ظاہر ہے کہ اپنے قدیم پاکستانی دشمنوں کی معبود کی قصیدہ گوئی کسی طرح نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بھجن اسی ابتدائی تنفّر کا مظہر ہے۔ اگر خاتونِ مذکور اس پیرائے میں سوچتیں تو ان کو اس حیرت کے اظہار کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن جب آریہ یہاں کے لوگوں میں گھل مل گئے تو اوشا کو بھی اُنھوں نے اپنا کر اس کے قصیدے کہنے شروع کر دیئے۔ بعض جگہ تو بابلی مناجات اور رگ وید کے اشعار میں اس قدر لفظی، معنوی اور تخیلی مشابہت ہے کہ ان کا مخرج ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔

"اُس نے اپنے گھوڑے وہاں جوتے،

جہاں سورج اُبھرتا ہے۔

ہر شے جگمگا گئی،

باوقار دُخترِ فلک۔ دشمنوں کو مار بھگاتی ہے

اوشا نے ہمارے حریفوں کو کچل دیا۔"

مذکورہ بالا اس نظم میں بعینہٖ بابلیوں اور اشوریوں کی مانند عشتار کو جنگ کی دیوی کے روپ میں پیش کیا :

" درخشندہ اوشا — تیرا مسکن دور ہے یا نزدیک ؟
معلوم نہیں۔
اے آسمانوں کی بیٹی — ہمارے یہ نذرانے قبول کر
اور ہماری خوشیوں کو لازوال کر دے — "

" اہانا — ہر گھر میں نور بکھیرتی دھیرے دھیرے چلی آتی ہے،
ہمیں برکت دیتی اور ہمارے نذرانے قبول کرتی ہے۔
دلہن کی طرح درخشاں اوشا،
جسے اُس کی ماں نے سنوارا ہو،
تو اپنے بندوں کو راستہ دکھاتی ہے،
مبارک اُوشا،
ظلمتوں کی چادر چاک کر دے،
کہ تیرے سوا اور کوئی اسے نہیں ہٹا سکتا۔ "

مندرجہ ذیل اشعار میں اسے مختلف تشبیہیں دے کر اسے حسن و محبت کی دیوی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے :

"حسین کنواری — جسے اُس کی ماں نے سنوارا
بیش قرار کپڑوں میں ملبوس زفاصہ،
سج دھج کر شوہر کے سامنے آنے والی سُہاگن،
حسینہ،
جو نہا دھو کر نکھر گئی ہو،
مُسکراتی — حُسن کے جادو جگاتی،
عاشق کو اپنا آپ دکھا کر،
شاد کام کرتی ہے۔"

بابل میں جس طرح یہ تموز دیوتا کی ماں بھی تھی اور محبوبہ بھی۔ اسی طرح یہ "دھرتی ماتا" ہندوؤں کے معبودِ اعظم شو کی ماں بھی تھی اور محبوبہ بھی۔ پاک و ہند میں اس کی پرستش ان ناموں سے اب بھی ہو رہی ہے:۔

دُرگا، پاربتی، کالی، ماتا، امبا، آتا، امبا بائی، مہا مائی اور جگت امبا دیوی۔

شام میں یہ عشتار، عتار، ماکتا اور ترجطہ، فینیقیہ میں عستارات اور عشتارتہ، کنعان میں عشتارتہ۔ ابی سینیا میں عتار اور چین میں شین شین کے نام سے اس کی عبادت ہوتی تھی۔ ایران میں یہ اناہتا کہلاتی تھی۔ اردشیر کے دورِ حکومت میں اناہتا اور مترا کی پرستش اہورمزد کے ساتھ کی جانے لگی۔ اس فرمانروا نے مندروں میں اس کے بُت رکھوا دیے جہاں اس کی

پرستش کی آڑ میں انتہائی بداخلاقیاں ہونے لگی تھیں۔

عشتار۔ یورپ میں

نویں صدی عیسوی میں شمال کی طرف سے جب اہلِ فریجیہ نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا تو یہاں وہ عشتار کی جاذبیت اور مقبولیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بلا تامل اسے اپنا کر اپنی دوسری دیویوں کی خصوصیات بھی اسے سونپ دیں اور پھر اسے یونان اور روم لیتے گئے۔ یورپ پہنچتے پہنچتے گو اس میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں لیکن اس وقت بھی اس میں گہرا بابلی اور سامی رنگ جھلک رہا تھا۔ یونان سے نکل کر یہ یورپ کے بہت بڑے حصے پہ چھا گئی۔ یورپ میں یہ وینس اور افرودیتی، ایدا، سائبلا، فریگا، جونو، ڈیانا اور ارتمس وغیرہ کے ناموں سے معروف تھی۔

غرض ایشیا، افریقہ اور یورپ کے علاوہ امریکہ تک میں مادرِ عظیم کی پرستش کے آثار ملتے ہیں۔ عشتار کے مندر بھی اس کے پھیلاؤ کے ساتھ دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بنتے چلے گئے مثلاً اُر، اریخ، بابل، لاگاش، نینوا، اربیل، قلعہ، اشور (عراق) ممفس، وندیرا، سکندریہ (مصر) صور، صیدون (فینیقیہ) عسقلان، دمشق (شام) ہڑپہ، موہنجوڈارو (پاکستان) ایتھنز اور روم وغیرہ۔

اُس کی صفات

چونکہ یہ بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس لئے جو بھی مذہبی تصورات و عقیدے ملتے ہیں وہ دُنیا

بس اُس کی نام لیوا تمام قوموں میں قریباً یکساں تھے۔ جیسا کہ بتلایا جاچکا ہے کہ ابتداً اسے حیات و بقائے حیات کی دیوی مان کر تخلیق کیا گیا اور زمانۂ قدیم سے لوگ اس کی پرستش دھرتی ماتا یا مادرِ معظمہ کی حیثیت سے کر رہے تھے لیکن مختلف اقطائے عالم میں اس کی بے پناہ مقبولیت کے باعث اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس پر اور بھی عقائد کا رنگ چڑھتا گیا اور جہاں بھی یہ گئی۔ وہاں کی مختلف دیویوں کی خصوصیات اس سے وابستہ ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ یہ گوناگوں صفات کا مرقع بن کر رہ گئی — مادرِ گل اور ربۃ عشق، یہ دو روپ اس کے ایسے ہیں جنھیں قریباً ہر قوم میں اوّلیت و اہمیت حاصل تھی۔ اس کے ماننے والے گو دوسرے معبودوں کی پرستش بھی کر لیتے تھے لیکن عام طور پر وہ اسے سب سے اُونچا درجہ دیتے تھے اس کی ابدیت اور لافانیت پر سب کا ایمان تھا متعدد اقوام میں وہ ایک مدت تک "لاشریک" کی حیثیت سے پوجی جاتی رہی۔

بہت سی بابلی مناجات میں اس کو کچھ اس انداز سے مخاطب کیا گیا ہے جس سے 'توحید ناقص' (   ) جھلکتی ہے۔ انسان نے جس قدر دُعائیں عشتار سے مانگی ہیں اتنی کسی بھی دُنیاوی معبود سے نہیں مانگی گئیں۔ قدیم عقائد ہوں یا تخیلات، گیت ہوں یا نظمیں، حکایات ہوں یا رزمیہ داستانیں، مناجاتیں ہوں یا منتر، عشتار یا مہاماتا ہر جگہ انسان کی ممدوح و موصوف ہے۔ وہ تمام دیوتاؤں اور پوری مخلوق کی ماں ہے،

وہ مادرِ مہربان ہے اور خالقِ اوّل، خالقِ کُل ہے اور پروردگارِ عالم، خاتونِ ارض ہے اور ملکۂ افلاک، بہارستان کی دیوی ہے اور کہساروں کی رانی، ملکۂ سحر، اور خاتونِ فردوس ہے — قوسِ قزح اُس کا مرصع گلوبند ہے اور برق لہراتا کوڑا — زمینوں، فضاؤں اور برف پوش پہاڑوں پر اس کی عملداری ہے۔ زمینوں، آسمانوں کے جملہ فیصلے وہی کرتی ہے۔ دعاؤں کو سنتی اور معروضات پر غور کرتی ہے۔ وہ راستی پسند، غم گسار و ہمدرد ہے۔ گناہ گاروں اور بد کرداروں کو صحیح راستہ دکھاتی ہے۔ گناہ گاروں کو جب دیوتا سزا دینے لگتے ہیں تو وہ ہمیشہ ان کی شفاعت کرتی ہے۔ امن وامان قائم رکھے ہوئے ہے مسافروں کی نگہ بان ہے۔ سرچشمۂ حیات کی حیثیت سے چشموں کے ساتھ اس کا خاص تعلق ہے۔ ایک جگہ کہتی ہے "پہاڑی چشمے پر پانی بھرنے جاتی ہوں" — ربہ تولید کی حیثیت سے کائنات کو حُسن و زندگی اور شادابی سے معمور کر دیتی ہے —

"آسمانوں میں اپنی جگہ لے کر،

بارش بھیجتی ہوں،

زمینوں میں اپنی جگہ لے کر،

ہریاول پیدا کرتی ہوں کہ — پھلے پھولے۔"

اپنے باپ آنو سے کہتی ہے "انسانوں کے لیے میں نے اناج کے ڈھیر لگا دیئے ہیں اور مویشیوں کے لیے چارہ پیدا کر لیا ہے — سات سالہ قحط"

بھی پڑے تو بھی میں اناج اور چارہ پیدا کر چکی ہوں۔"

ہیروڈوٹس نے اس کا ایک نام "مائلتا" دیا ہے۔ یہ لفظ در اصل بابلی "مُولِدتُو" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "وہ جو اسبابِ تخلیق پیدا کرتی ہے۔"

لیکن ساتھ ہی وہ کبھی خفگی کے عالم میں اپنی شفقتوں سے ہاتھ بھی کھینچ لیتی ہے اور جب وہ ایسا کرتی ہے تو نہ صرف پوری دنیا خشک سالی کی لپیٹ میں آجاتی ہے بلکہ کوئی بھی ذی روح سلسلۂ تولید کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ موسموں کے تغیر و تبدل سے متعلقہ گیتوں میں اس کے یہ دونوں روپ پیش کیے گئے ہیں یعنی کہ شفیق و پالنہار اور ظالم و غارت گر۔ طوفان کی ملکہ کی حیثیت سے وہ زمینوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور آسمانوں کو لرزا دیتی ہے۔ وہ دیوتاؤں کے برخلاف نبرد آزما ہے۔ وہ خنجرِ آبدار ہے۔

ایک طرف اگر ہمہ تن عشق و محبت ہے تو دوسری طرف بے وفائی و جلیبیت کا مرقع ہے۔ جنسی جذبہ کی محرک وہی ہے۔ جب وہ پاتال گئی تو کیا انسان اور کیا حیوان، جنسی تحریک سب میں ختم ہو گئی تھی۔

طوفان سے متعلقہ سومیری روایت میں دیوتاؤں نے جب نسلِ انسانی کی تباہی کی قرارداد منظور کی تو عشتار نہ صرف اس مشورے میں شریک تھی بلکہ طوفان لایا ہی اس کی منظوری کے بعد گیا تھا۔ اور جب اس نے اپنے فیصلے کے نتائج اپنی مخلوق کی لرزہ خیز تباہی کی صورت میں رونما ہوتے دیکھے تو متأسف و رنجیدہ ہو کر خود ہی بین بھی کرنے بیٹھ گئی۔ مصری طوفانی حکایت کی رو

سے خود اس کا ظلم بے پناہ تھا۔ وہ طوفانوں کو جلو میں لیئے انسانوں کو تباہ کرتی پھر رہی تھی اور اس وقت باز آئی جب اسے انسانی خون سے آلودہ شراب پلا کر مدہوش کر دیا گیا — سن کی یہ جنگجو بیٹی اور سورماؤں کی دیوی جنگ سے ذرا پہلے اشوری جنگجوؤں کا دل بڑھانے کو کچھ وقت کے لیئے نمودار ہوا کرتی تھی۔

عِشتار اور زہرہ

بابلیوں نے باقاعدہ اصول اور کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت اپنے دیوی دیوتاؤں سے کچھ خاص اعداد، مہینے، رنگ اور سیارے مخصوص کر رکھے تھے۔ عشتار کے لیئے پندرہ کا عدد، چھٹا مہینہ، زرد رنگ اور زہرہ سیارہ مخصوص کیا ہوا تھا۔[1] اس سیارے کی عشتار سے مماثلت بھی بڑی دلچسپ ہے مثلاً جب زہرہ اپنی روشن ترین حالت میں ہوتی تو اس کی شعاعیں عشتار کی ڈاڑھی سمجھی جاتیں شام کو زہرہ مؤنث اور صبح مذکر خیال کی جاتی تھی۔ عشتار در اصل ان کے خیال میں دو جنسی دیوی تھی۔ صبح کے تارے[2] کی حیثیت سے وہ دلبت اور شام کے ستارے کی حیثیت سے زب کہلاتی تھی۔ عرب میں اسے اَلمقہ بھی کہتے تھے۔

---

[1] بابلیوں نے دوسرے دیوتاؤں سے سیارے یوں مخصوص کیے تھے:
مرودخ (مشتری) ؛ نِنب (زحل) ؛ نبو (عطارد) ؛ نرجل (مریخ) ؛

[2] عراق میں ستارے کو "کوکب تا" "کوکب نُقا" اور بابل میں "کاکب" کہتے تھے ؛

"عشتار — صبح کی دیوی
عشتار — شام کی دیوی

میں ہوں۔"

نجومی روشن زہرہ کو سعد اور کم تر تابناک کو نامبارک خیال کرتے تھے اس سے شگون یوں لیا جاتا کہ — "جب نیسان (کے مہینے) میں پہلے دن سے لے کر تیسویں دن تک غروب آفتاب کے وقت زہرہ غائب ہو جائے تو تباہی و مصائب نازل ہوں گے اور جب نیسان ہی میں زہرہ کے 'داڑھی' ہو تو اس سرزمین کے باشندوں کے ہاں لڑکے پیدا ہوں گے — اور بازار کے بھاؤ اس سال گر جائیں گے" — کوکبی خصوصیات کے سلسلے میں اسے مختلف القاب سے یاد کیا گیا ہے — 'تجلیِ کائنات' ارض و سما کی درخشاں مشعل، 'ملکۂ کواکب' — تجلیِ کامل، اور 'منور عشتار' جو شام کو روشن کر دیتی ہے" — وغیرہ۔

عقائد کا اظہار آرٹ میں

لوگوں نے اس سے متعلقہ اپنے عقائد کا اظہار نقاشی و مصوری، سنگتراشی و تعمیر، غرض مختلف پیرائے میں کیا ہے اور بعض جگہ تو اسے بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس طرح نہایت نفیس و دلنشین فن پارے تخلیق کئے گئے۔ مختلف ملکوں سے قبل از مسیح کے اس کے جو چھوٹے چھوٹے مجسمے ملے ہیں ان میں ابتداً یہ اپنی عریاں چھاتیوں کو دبا کر دودھ نکالتی نظر آتی ہے

بعد میں اس کے ہاتھوں میں لوٹا دکھایا جانے لگا جس سے پانی اُبل کر گر رہا ہوتا ہے۔ یہ گویا آبِ حیات ہے جو وہ دُنیا کو بخش رہی تھی۔ پدری نظام کو جب غلبہ ہوا تو یہی آنو کے ہاتھ میں آگیا۔ پالنہار کے روپ میں کہیں تو وہ کئی بچوں کو ادھر اُدھر جمع کیے یا لباس میں چھپائے ایک بچے کو دودھ پلاتی نظر آتی ہے، کبھی بالکل برہنگی کے عالم میں سینہ پر ہاتھ باندھے اور کبھی گود میں بچہ تھامے ملتی ہے۔ کہیں پانیوں کی دیوی نناّ کی حیثیت سے وہ اپنے تخت کے نیچے مچھلیاں اور دوسری آبی مخلوق لیئے بیٹھی ہے۔

کہیں 'قمری' کی شکل میں محبت کی دیوی اور کہیں فوجی لباس میں ملبوس تیر کمان لگائے جنگ کی دیوی بنی کھڑی ہے۔ 'زہرہ' کی دیوی کی حیثیت سے وہ ایک لمبی پوشاک پہنے ہے اور سر پر آٹھ شعاعوں والا ستارہ چمک رہا ہوتا ہے۔ ایک جگہ اسے سورج کے ساتھ پہاڑوں پر محوِ پرواز دکھایا گیا ہے۔ مصریوں کی چاند دیوی کے روپ میں بالکل عریاں، شیرنی کی پشت پر سوار ہے اور ایک ہاتھ میں کنول اور دوسرے میں دو اژدہے تھام رکھے ہیں۔ 'خاتونِ اسپاں' کی حیثیت سے مصر میں وہ چار گھوڑوں والے رتھ میں سوار افتادہ دشمن کو روندتی چلی جا رہی ہے۔ اشوری دور کے بعد اس کی جو شبیہیں ملتی ہیں ان میں یہ بڑے ہی ہیجان انگیز اور کشش انگیز انداز میں عریاں کھڑی ہے۔ بعض جگہ وہ پوشاک اُٹھائے اپنی کشش دکھا رہی ہوتی ہے۔

قدیم یونانی پہلے پہل تو اسے خوبصورت پوشاک پہنے کبھی بیٹھی اور

اکثر کھڑی دکھاتے تھے۔ پھر اسے برہنگی کے عالم میں سمندر سے ابھرتے یا نہا کر نکلتے دکھانے لگے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یونان میں اسے معبود کی حیثیت سے پیش کرنے کے رجحانات کم ہوتے چلے گئے۔ بالآخر متبسم اور جاذبِ نگاہ چہرے، مسکراتی آنکھوں والی محض خوش رو عورت کے طور پر اسے پیش کیا جانے لگا ــ رومن آرٹ میں یہ ملکہ کی حیثیت سے نفیس پوشاک زیبِ تن کیے، سر پہ تاج اور مُنہ پہ نقاب گرائے کنواریوں کے جھرمٹ میں گھری ملتی ہے۔

اُس کے عشقیہ افسانے

ہر ملک کی دیومالا میں عشتار کے رومانی افسانے مشہور تھے۔ اس کا سب سے نامور عاشق بابلی دیوتا تموز تھا۔ اپنی فقید المثال مقبولیت کی مالک محبوبہ کی طرح یہ بھی عوام میں بہت مقبول رہا ہے۔ بابلی روایات کی رُو سے یہ عشتار کا عاشق بھی تھا اور بھائی بھی۔ ہر ملک میں یہ ایک بار مر کر پھر زندہ ہُوا تھا اور بعض بابلی حکایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قتل میں خود عشتار کا ہاتھ تھا۔ اسی حسرت ناک موت کی یاد میں ہر جگہ یہاں تک کہ اسرائیلیوں میں بھی اس کا ماتم بڑے جوش و خروش سے برسرِ عام کیا جاتا تھا اور عورتیں اس ماتم گساری اور سینہ کوبی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی تھیں۔

لہ یونانیوں کے خیال میں عشتار یا افرودیتی سمندر سے پیدا ہوئی تھی۔

یہی دیوتا تموز بابل سے نکل کر عشتار کے ساتھ ساتھ مختلف ملکوں میں پہنچا اور ان دونوں کے عشق کی بابلی روایات ضروری تغیر و تبدل کے بعد مشہور ہو گئیں۔ مصر میں آئسس اور اوزیرس فینیقیہ میں عشتارتہ اور ایڈونی روم میں سائبلا اور عطیس اور یونان میں افرودیتی اور ایڈونس کے نام سے یہ افسانے مشہور تھے۔ ایران میں تموز کا نام شر اور عرب میں تعذ تھا۔

حسنِ اتفاق سے عشتار و تموز کے رومان کا بابلی منظوم قصہ مل گیا ہے اس میں تموز کی موت اور پھر عشتار کے اس کی تلاش میں پاتال[1] جانے کے واقعات بڑے دلچسپ اور عمدہ پیرائے میں مذکور ہیں۔ عراق سے وہ تختیاں جن پر یہ واقعات درج ہیں صندوق میں بھر کر لندن روانہ کی گئیں اور وہاں سب سے پہلے برٹش میوزیم کے جارج سمتھ نے بڑی عمدگی اور روانی سے اس کا ترجمہ کیا۔

بابلی ادب میں یہ قصہ بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے تخیلات و رجحانات دوزخ اور حیات بعد از موت کے نظریئے پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ یہ منظوم قصہ بہت قدیم یعنی چار ہزار برس قبل مسیح بلکہ غالباً اس سے بھی پہلے کا ہے اور ۱۳۷ سطور پر مشتمل ہے لیکن نامکمل ہے۔

---

[1] پاتال کو عراق قدیم میں "ارالو" اور "شیول" کہا جاتا تھا۔

عشتار، تموز[1] کی تلاش میں روانہ ہوتی ہے اس سج دھج کے ساتھ کہ نادرِ روزگار مرصع مکٹ (تاج) آویزے، ہار، صدری، پازیب، کنگن، ٹیکا اور چوغہ پہنے تھی۔

"میرے بازو پروں کی طرح پھیلے،
اور میں اندھیرے گھر کو چلی ہوں
وہ گھر، —
جو دیوتا ارگلا کا ہے
وہ گھر،
جس کے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں
وہ گزرگاہ،
جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔
جس کے دروازوں سے روشنی چھین لی گئی ہے،
جس کے مکینوں کی خوراک خاک اور مٹی ہے۔
جہاں سربرآوردہ لوگ بھی پروں سے ستر پوشی کرتے ہیں،
جہاں کبھی روشنی کا گذر نہیں ہوتا،
جس کے دروازوں اور دریچوں پر خاک جمی ہے؛

---

[1] تموز دراصل اکادی لفظ "دُمُوزی" سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں "زندگی کا بیٹا" یا "اکلوتا بیٹا" — آریدو میں اس کی پرستش سورج دیوتا کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ تموز آسمان کا چرواہا تھا اور اس کے مویشی "بادل اور سفید گُہر" تھے۔

اور جب عشتار برزخ کے دروازے پر پہنچی تو دربان سے چلا کر کہا:-

"دربان!

دروازہ کھول تاکہ اندر آؤں۔

نہیں کھولے گا

تو اسے توڑ پھینکوں گی — پیچوں کو نکال دوں گی،

اندر آکر،

مُردوں کو جلا دوں گی،

کہ زندوں کو کھا جائیں،

اور پھر مُردوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔"

دربان تموز کے فراق کی ماری غضب آلود عشتار کو تسلی دے کر پاتال کی دیوی رِشکی جل سے پوچھنے گیا

رِزجل (مریخ) دیوتا کی بیوی رِشکی جل (جس کا ایک نام اللات بھی ہے) خود بھی تموز پر فدا ہو گئی تھی اس نے جو بہن کی آمد کی خبر سُنی تو بھڑک اُٹھی۔

"یہ یہاں کیوں آئی ہے؟

کیا سوچ کر آئی ہے؟

خاک پھانکے گی یا مٹی چاٹے گی؟

اور پھر رِشکی جل نے تاسف کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر کیا جنھیں عشتار نے سپردِ اجل کر دیا تھا۔

"مجھے رونے دو،
ان جوانوں پر جو بیویوں کو چھوڑ آئے،
مجھے رونے دو،
ان مہوشوں پر جو شوہروں کی آغوش سے بچھڑ گئیں،
اس اکلوتے بچے پر جو قبل از وقت یہاں چلا آیا۔
اور پھر یکلخت بڑی درشتگی سے حکم دیا:
"دربان جا دروازہ کھول دے۔ اور پرانے دستور کے مطابق اسے لے آ۔"
پرانے دستور کا مطلب یہ ہے کہ عشتار کو بھی اسی طرح لایا جائے جس طرح دوسروں کو لایا جاتا تھا — دربان واپس دروازے پر پہنچا۔
"آئیے خاتون — خوش آمدید،
پاتال کا عظیم الشان محل آپ کا خیر مقدم کرتا ہے۔
برزخ یا پاتال کے سات دروازے تھے اور ہر دروازے میں داخل ہونے سے پہلے دربان عشتار کے بدن سے ایک چیز اتروا لیتا تھا۔ پہلے دروازے پر اُس نے بڑی ہی گستاخی سے اس کا بے مثل تاج جھپٹ لیا۔
"کیوں اے دربان — یہ میرا تاج کیوں لے لیا۔"
"تشریف لائیے ملکہ — یہ اُلات کا دستور ہے۔"
دوسرے دروازے پہ آویزے لے لیئے تیسرے پر ہیروں کا ہار،

عشتار - پاتال میں
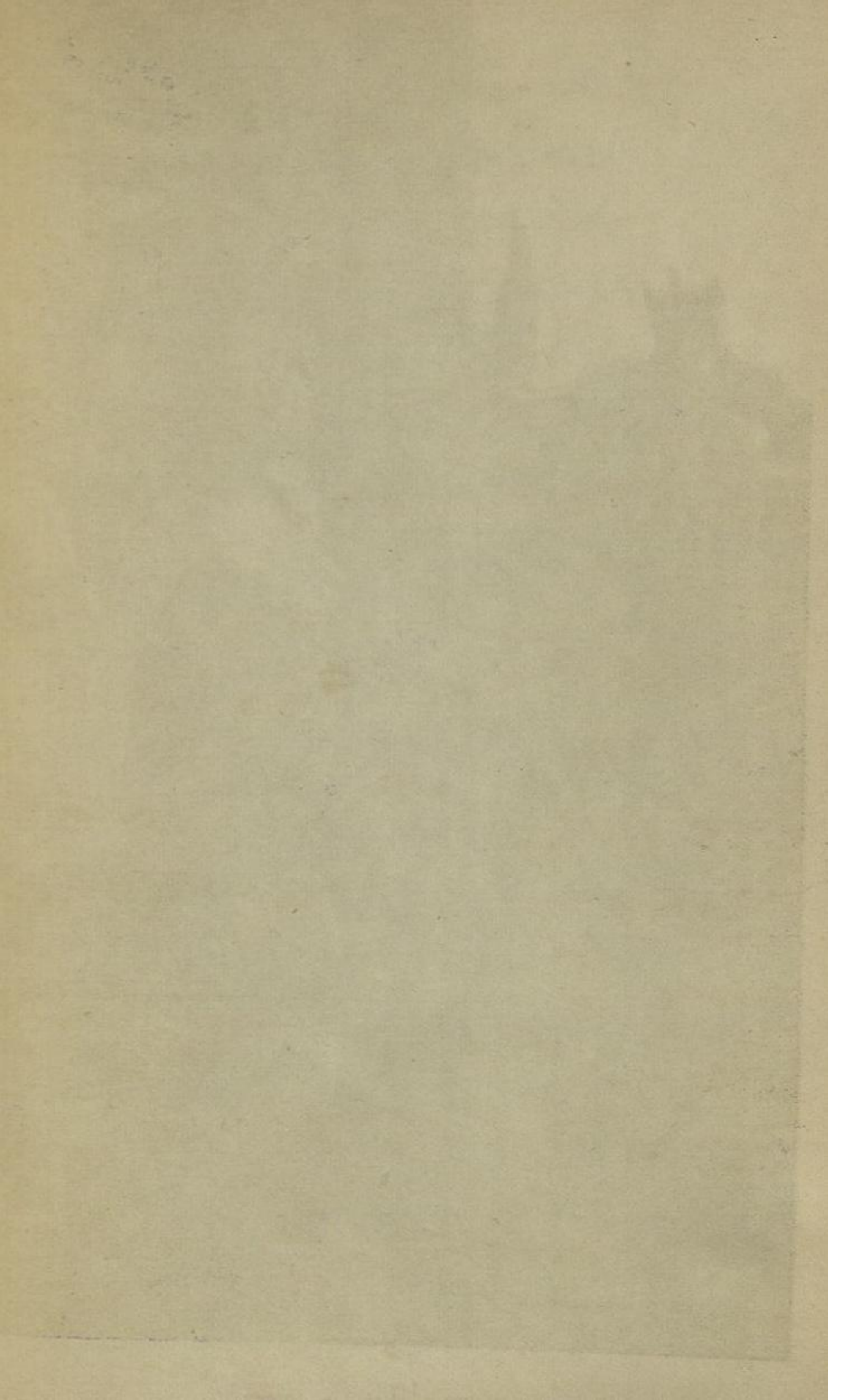
چوتھے پر سینہ کے زیورات، پانچویں پر زمرّدی پٹکا، چھٹے پر کنگن اور آخری دروازے پر بیچاری کا لباس بھی چھن گیا۔ ہر دروازے پر وہ وجہ پوچھتی تو جواب ملتا "یہاں کا دستور ہے۔"

اور جب وہ ملکۂ پاتال کے سامنے پہنچی ہے تو اس عالم میں کہ وہ بالکل ننگی تھی۔ اس حال کو پہنچ کر بھی اس کے ناز و نخرے اور دیدہ دلیری میں ذرا فرق نہ آیا۔ کبر و نخوت کا مرقع بنی کھڑی تھی اور ادھر رشک کی جل بھی اپنی رقیب کو سزا دینے پر تُلی بیٹھی تھی جو بڑی مشکل سے اُس کے ہاتھ آئی تھی۔ اُس نے نامتر کو حکم دیا کہ دخترِ ماہتاب کے ننگے بدن — اُس کی آنکھوں، اُس کے سر، پیروں، پہلوؤں اور دل کو مختلف امراض سے داغ دے۔ یہ نامتر پلیگ اور دیگر بیماریوں کا شیطان تھا اور جب چلتا تو اس شان سے کہ ساٹھ بیماریاں جلو میں ہوتی تھیں۔

عشتار کے ان مصائب کا اثر پوری کائنات پر پڑا۔ افزائشِ نسل اور روئیدگی کے تمام سوتے سوکھ کر رہ گئے۔ ہر طرف اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اسی اثناء میں دیوتاؤں کا مخبر پپ سکل یہ سارا ماجرا شمش کو کہنے دوڑ گیا اور شمش بہن کے دکھ سن اور ایا کو بتلاتے ہوئے رو دیا۔ تینوں سر جوڑ کر بیٹھے آخر ندوش نمریا اشوش نامر نامی ایک انسان نما تیار بنا کر، اور اسے برزخ کے سارے دروازوں سے گزر جانے کی قوت تفویض کر کے عشتار کی رہائی کی خاطر بھیجا گیا۔ اس نے جو دیوتاؤں کا

پیغام پہنچایا تو رشکی جل نے مارے غصے کے اپنا سر پیٹ لیا۔ انگوٹھا کاٹ کھایا" اور پھر ندوشِ نمر پہ برس پڑی۔

"کیا بجھے قید خانہ کی ہوا کھلا دوں تاکہ گندگی اور غلیظ پانی تیری خوراک بنے — قید خانہ کی تاریکی تیرا مسکن اور لکڑی نشستگاہ اور بھوک پیاس تیرے بچوں کو تڑپا دے —"

بالآخر اُس نے اربابِ عظیم کے فیصلہ سے مجبور ہو کر نامتر کو حکم دیا۔

"عشتار پر آبِ حیات چھڑک کر میرے سامنے لے آ۔"

عشتار پھر ساتوں دروازوں سے گزری۔ اُس کی تمام چھینی ہوئی چیزیں واپس مل گئیں اور وہ پھر رعنائی و جاذبیت کا مرقع بنی دُنیا کی طرف لوٹ آئی اور ساتھ ہی دُنیا میں پھر بہار آئی۔ نظم میں یہ صاف طور پہ بیان نہیں ہُوا کہ آیا تموز بھی اسے ملا یا نہیں؟ قیاس کہتا ہے کہ ان کا ملاپ ہو گیا ہو گا۔ پاتال کے دروازے پہ نامتر یا دربان، عشتار سے کہتا ہے:

"اگر اس نے (رشکی جل) تجھے وہ کچھ نہیں دیا جس کے لیئے دتاوان، ادا کیا گیا تو اس کے پاس اپنی جوانی کے دولھا تموز کے لیئے لوٹ جا — اس پر آبِ حیات اور قیمتی تیل چھڑک۔ ارغوانی لباس پہنا اور اس کے ہاتھ میں بلوری انگشتری ڈال۔ — مسرت کی دیوی محبت کو جگہ میں سمانے دے۔"

عشتار کی عشق خیز طبیعت کو تموز ہی پہ بس نہیں تھا۔ بابلیوں کے

ہاں اُس کے عشاق کی فہرست خاصی طویل ہے۔ بابل کے مشہور وجیہہ سورما جلجمیش کو جونہی اس نے دیکھا تو فوراً اظہارِ عشق کر بیٹھی

"جلجمیش آ — اور میرا محبوب بن جا — تو میرا شوہر بن اور میں تیری دُلہن بنوں گی۔ جواہرات سے مرصع سُنہری رتھ دوں گی۔ جس کے پہیے بھی سنہری اور مزین ہوں گے۔ تجھے یاقوتی قرنا بھی دوں گی۔ تیرے جنگی گھوڑے صاف ستھرے اور سفید براق کی مانند ہوں گے میرے معطر اور آراستہ گھر کا مالک تُو ہو گا — اے جلجمیش رُوئے زمین کے بادشاہ اور شاہزادے تیرے سامنے جھک جائیں گے — تمام مخلوق حلقۂ غلامی لیئے تیری قدم بوس ہو گی —"

لیکن "اروک" کا زیرک، سرد دماغ اور مُنہ پھٹ حکمراں عشتار کی ساری بے وفائیوں سے بخوبی آگاہ ہے وہ اس کے بھرّوں میں آنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔

"تُو اپنے کسی سابقہ شوہر کی وفادار رہی بھی ہے؟ تیرے شباب کے عاشق تموز کا سوگ ہر سال منایا جاتا ہے، تُو خود ہی اسے مار کر اب روتی بھی ہے۔ تو نے اللہ (عقاب) سے محبت رچائی اور پھر اس کے پَر نوچ پھینکے اور اب وہ جنگلوں میں چلاتا پھرتا ہے "ہائے میرے بازو"۔ تو نے شیر کے ساتھ پیار کا کھیل کھیلا

اور حسب معمول اسے بھی دھتکار دیا۔ تیری الفت کا اگلا شکار
گھوڑا تھا، تو ہی اس غریب کو بگھی میں جوت کر پچاس میل سرپٹ
بھگائے لیے چلی گئی۔ بے چارہ خستہ ہو کر رہ گیا۔ اس کی ماں سلیلی
کو بھی تو نے اپنے ستم کا نشانہ بنایا۔ پھر تیری نظرِ کرم تبولو۔
چرواہے پر پڑی۔ وہ تیرے لیے میمنے ذبح کرتا رہا لیکن تیری
ہی مہربانی سے وہ چیتا بن گیا۔ اور اسی کے کتوں نے اسے
پھاڑ کھایا۔ اور تو اپنے باپ آنو (دیوتا) کے باغباں
اِشلنو پر فدا ہوئی اور پھر جو تو نے اس سے آنکھیں پھیری ہیں
تو مفلوج ہو کر رہ گیا۔ مجھے تو معاف ہی رکھ۔ خدا نہ کرے
کہ تیری شفقتیں میرے شامل حال ہوں ورنہ میرا انجام بھی ان
جیسا ہو گا۔"

عشتار نے جو یہ کھری کھری سُنی تو سارا نشۂ عشق کافور ہو گیا۔ غصہ
سے کانپتی بھاگی بھاگی اپنے ماں باپ 'انات' اور 'آنو' کے پاس پہنچی۔
"اے میرے ابا — جلجمیش نے مجھے دیکھا ہے
اس نے میرے گجرے گنے ہیں — میرے گجرے اور کمر
کی ڈوریاں[1]۔"

---

[1] عشتار غالباً یہاں ماں باپ کی غیرت ابھار رہی ہے تاکہ وہ بیٹی پر بُری نگاہ (بقیہ بر صفحہ ۴۳)

اور آسمانوں کے اس نیک دل دیوتا کو اس کی مرضی کے خلاف ایک
خونخوار بیل آنو پیدا کرنے پر مجبور کیا جو منہ پھٹ اور گستاخ جلجموس کے
حواس ٹھکانے لگا سکے۔ جلجموس بھی آسانی سے قابو میں آنے والا نہ تھا۔
بیل کو تو اُس نے اپنے دوست ایابنی کی مدد سے مار گرایا۔ تب وہ غصے
میں بھر کر "ارتیخ" کی فصیل پہ کھڑی ہو گئی اور بد دعا دی۔

"جلجموس پہ لعنت — پھٹکار — جس نے مجھے ناراض کیا
اور مقدس بیل کو مار ڈالا۔"

اِس پر ایابنی نے مقتول بیل کے دھڑ کو عشتار کے منہ پر کھینچ مارا اور چیلنج
کیا۔

"لعنت ہو تجھ پر — میں تجھے زیر کر کے رہوں گا — میں تیرے
ساتھ بھی وہی کچھ کروں گا جو بیل کے ساتھ کیا ہے۔"

لیکن بعدازاں چاند بیٹی کے شدائد سے مجبور ہو کر جلجموس اپنے بزرگ
اُت نا پشتم کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تاکہ اس سے آبِ حیات کا راز معلوم
کر سکے۔

عالم گیر ماتم گساری اور تیوہار

چونکہ عشتار کا تموز ہر ملک میں ایک بار
مر کر زندہ ہوا تھا۔ اس لیے ہر جگہ ان دونوں

بقیہ صفحہ ۴۲

نگاہ ڈالنے والے سے انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتے۔ اُس سے اس زمانے کے لوگوں
کے نظریہ اخلاق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

عاشق و معشوق کے فراق اور ملاپ کا ماتم اور جشن کسی نہ کسی صورت میں کئی روز تک منایا جاتا تھا۔ سومیری و بابلی مذہب کی یہ ایسی خصوصیت ہے جو عالمگیر تھی۔ بابل، مصر و فلسطین، شام، یونان، روم، قبرص اور کریٹ وغیرہ میں ان دونوں کے حسین بُت بنا کر سُرخ لباس پہنایا جاتا اور پھر انھیں کسی دریا پر لے جا کر معطر پانی سے نہلایا جاتا اور وہاں لوگ خصوصاً عورتیں ان کے سامنے بال بکھرائے سینہ کوبی کیا کرتیں۔

سومیر کے شہر لاگاش میں یہ ماتم سال کے چھٹے مہینے، گرما کے قریباً وسط میں ہوتا تھا اور اگر وہ اپنے سال کا آغاز موسم بہار کے نقطۂ عروج سے کرتے ہوں تو پھر یہ ستمبر کا مہینہ ہوتا ہوگا۔ لاگاش والے اس مہینہ کو۔ "تموز کے تیوہار کا مہینہ" کہتے تھے لیکن نپور میں یہ "اِنّی کے مقصد کا مہینہ" کہلاتا تھا۔ (کیونکہ عشتار کا مقصد تموز کو واپس لانا تھا) نئی فصل کے موقعوں پر تموز کے لیئے سومیر کے شہروں میں ایک زبردست تیوہار منایا جاتا۔ اس موقعہ پر ایک نوعمر پجاری اور خوبرو پجارن کو منتخب کر کے پہلے تو پورے شہر میں ان کا جلوس نکالا جاتا اور پھر شام کو سب سے بڑے مندر کے صحن میں یہ دونوں پجاری کے سامنے جنسی فعل سرانجام دیتے۔ اس کے بعد ان دونوں کو مار کر، مختلف بیش قرار اشیا کے ساتھ زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا۔

بابلیوں کے ہاں ان کا چوتھا مہینہ "تموز" (جون۔ جولائی) محبِ عشتار کے سوگ کے لیئے مخصوص تھا۔ ان کے خیال میں یہی مہینہ تھا جب تموز فرات

کی لہروں میں ان پھولوں کے ساتھ سما گیا تھا جو اس پر پھینکے گئے تھے۔ پانچویں مہینے اَب (جولائی۔ اگست) میں چوں کہ عشتار تموز کو دوبارہ واپس لانے کے لیئے پاتال گئی تھی۔ اس لیئے یہ عشتار کا مقدس مہینہ تھا۔ ماہِ 'سوان' کی پچیس تاریخ عشتار کے جلوس کے لیئے متعین تھی۔ چھٹے مہینے 'اِلُل' کو بابلی 'اِنِنی کے مقصد کا مہینہ' بھی کہتے تھے۔

مصر میں آئسس (عشتار) اور اس کے مصری محبوب اوزیرس کی یاد میں تین عظیم الشان میلے لگتے تھے۔ جن میں مختلف طریقوں سے زندگی کے واقعات پیش کیے جاتے۔ آئسس کا میلہ الگ بھی لگتا تھا۔ پروہت پہلے تو روزوں اور عبادت میں مشغول رہتے اور ان فرائض کی ادائیگی کے بعد وہ ایک بیل قربان کرکے اس کے پیٹ میں مختلف خشک میوے بھر دیتے اور پھر تیل چھڑک کر اسے آگ پر پکایا جاتا۔ لوگ اپنے جسم کو ایذا پہنچاتے اور قربانی کا گوشت کھاتے تھے۔ ان مواقع پر جملہ اخلاقی قدروں کا تار و پود کھلے بندوں بری طرح بکھر جاتا اور ہر قسم کی بے راہروی عموماً روا رکھی جاتی۔ مصر کے ایک نہایت متبرک جزیرے 'فلی' (قدیم پالک) کے متعلق مصریوں کا خیال تھا کہ وہاں اوزیرس کی قبر ہے۔ یہاں جو مذہبی رسوم ادا ہوتیں۔ انھیں انتہائی صیغۂ راز میں رکھا جاتا۔

یونانی دَور میں ایڈونیس کی یاد میں ہر سال گرمیوں کے اواخر میں سکندریہ ایتھنز، بائبلوس اور دیگر مقامات پر عظیم الشان تیوہار منائے جاتے تھے۔

یہ تیوہار ایڈونیا کہلاتے اور دو دن تک رہتے تھے۔ پہلے روز ایڈونیس اور افرودیتی کے بُت چاند کے تخت پر پہلو بہ پہلو رکھے جاتے ان کے گرد چاندی کی ٹوکریوں میں موسمِ رواں کے پھل، خوشبوؤں بھرے سُنہری صندوقچے، روٹیاں، روغن اور شہد بھی رکھا جاتا تھا۔ اگلے دن دونو کے بُت سمندر کے کنارے لے جائے جاتے جہاں پریشان مُو عورتیں سینہ عریاں کیئے، سینہ کوبی کرتیں۔ پھر عورتیں ان دونوں کے بت سمندر میں پھینک دیتیں اس موقعہ پر لوگ ایک مخصوص گیت گاتے تھے۔ ایتھنز میں اس موقعہ پر جا بجا مصنوعی پھول اُگائے جاتے۔ اسے وہ 'ایڈونیس کا باغ' کہتے تھے۔

روم میں عشتار کے دلدادہ عطیس کی موت اور پھر اس کی حیاتِ ثانی سے متعلقہ سالانہ تہوار سب سے بڑا تھا۔ ۱۴ مارچ سے ۱۰ مارچ تک چھ روز تو یہ حکومت کی زیرِ نگرانی ہوا کرتا تھا — جس میں کھیلوں اور دیگر تفریحی و فوجی مشاغل کا مظاہرہ ہوتا تھا اور پھر اس کا سلسلہ ۱۵ سے ۲۷ مارچ تک اس طرح جاری رہتا کہ ۱۵ مارچ کو ایک چھ سالہ بیل 'مہا پجارن'، 'کاہنِ اعظم' اور 'مادرِ مہربان کے کوہساروں' مرغزاروں کے نام پر قربان کیا جاتا تھا۔ ۲۴ مارچ کا دن عطیس کی حسرت ناک موت اور عشتار کے اپنے نامراد عاشق کے لیئے نالہ و شیون اور عصمت بابلی کی یاد منانے کے لیئے مخصوص تھا۔ اس روز لوگ بڑے جوش و خروش

سے ماتم کرتے اور اسی دن روزہ و پرہیزگاری خصوصاً جنسی مواصلت سے قطعاً گریز و پرہیز کیا جاتا تھا — اس روز پروہت جمِ غفیر کے ساتھ سنکھ، جھانجھ، ناقوس اور بانسریاں وغیرہ بجاتے ہوئے عطیس کا بُت اٹھائے بین کرتے، چیختے چلاتے اور سینہ کوبی کرتے نکلتے تھے اور پھر انتہائی ہیجان اور خود فراموشی کے عالم میں خود کو طرح طرح کی جسمانی ایذائیں پہنچاتے، پروہت اس حد تک بڑھ جاتے کہ اپنا عضوِ مخصوص بھی نوچ ڈالتے تھے[1] — پھر وہ عطیس کا بُت لے جا کر ایک قبر میں عارضی طور پر دفن کر دیتے۔ بیل کے خون سے بپتسمہ اور نو امیدوار پجاریوں کی مذہبی اطاعت اور خدمت گزاری کی رسوم بھی اکثر اسی دن ادا کی جاتیں۔

۲۵ مارچ کو رومی دُنیا کے تیوہاروں میں ممتاز ترین حیثیت حاصل تھی۔ پورا ملک اس روز مسرت و شادمانی میں ڈوب جاتا تھا۔ لوگ سب رنج و الم بھول کر بڑی سرگرمی سے تقاریب میں حصہ لیتے اور عطیس کا بُت بھی اُس کی عارضی قبر سے نکال لیا جاتا۔ ان کے خیال میں وہ اسی روز دوبارہ زندہ ہوا تھا۔ ۲۶ مارچ آرام و سکون کے لئے مخصوص تھا اور ۲۷ کو مادرِ مہربان کا روپہلی بُت بڑے کرّوفر سے نکالا جاتا۔ قربانی کے بیل کے خون سے

---

[1] یہی وجہ تھی کہ اس کے اکثر فریجیئن مخنث ہوتے تھے۔ یہ لوگ زنانہ کپڑے پہنتے اور خوشبوؤں میں بسے رہتے تھے۔

بپتسمہ بھی اُسی روز دیا جاتا تھا۔ جو ان کے خیال میں پاک و منزہ اور حیات جدید عطا کرنے والا ہوتا تھا۔

قدیم پاکستان میں اس ماتم گساری اور تیوہار کے آثار تا حال نہیں مل رہے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں یہاں بھی عشتار اور اس کے محبوب کی یاد میں کچھ اسی طرح کی رسوم ادا ہوتی ہوں گی۔ جن کے اثرات کی بنیادی طور پر جھلک ہم، اگر غور کریں تو ہندوؤں کے مشہور تیوہار دسہرہ کے پسِ منظر میں دیکھ سکتے ہیں۔

آریہ جب واردِ پاکستان ہوئے تو وہ پاکستانیوں کے اس تیوہار کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوئے پاکستان میں عشتار کا عاشق غالباً سَن (چاند دیوتا) تھا۔ کیوں کہ یہ لوگ مادری تہذیب کے نام لیوا تھے اور مادری تہذیب والوں کے ہاں چاند کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے (یاد رہے سومیریہ وغیرہ میں تموز "سورج دیوتا" سمجھا جاتا تھا)۔ پھر رفتہ رفتہ ہندوؤں کی مشہور فرضی داستان رامائن تخلیق ہوئی اور ہمارے خیال میں نہ صرف یہ داستان بلکہ اس کے کرداروں کے نام تک رام چندر اور سیتا، مستعار لیے گئے۔ اس موقعہ پر عشتار اور سیتا اور چن (در) اور سَن کی لفظی مشابہت قابلِ غور ہے۔ ممکن ہے کہ پاکستانیوں کے ہاں عشتار اور سَن کا کوئی ایسا نام موجود ہو جو لسانی اعتبار سے سیتا اور چن در (چاند) سے کافی قریب ہو۔ بہر حال اس قصہ اور تیوہار کی شکل بدری نظام کے حامل آریاؤں کے

کے ہاں آکر بہت کچھ بدل گئی — وہاں عشتار کا محبوب کہیں تو قتل ہو کر بچھڑ جاتا ہے اور کہیں اغوا کر لیا جاتا ہے اور ادھر بھی رام کی سیتا کو راون لے بھاگتا ہے وہاں اس کے فراق کی ماری عشتار اسے لانے کے لیئے مصائب سہتی ہے، ادھر بھی رام چندر دشواریوں پر قابو پا کر سیتا کو لاتے ہیں ادھر عشتار کی مدد کیلیئے شمش، اسن، ایا، ندوش نز، را اور فریوس وغیرہ موجود ہیں ادھر رام کو ہنومان سگریو، لکشمن اور بھبھکشن وغیرہ کی حمایت حاصل ہے۔

اُس کا اخلاقیات پر اثر

عشق و محبت اور جنسی تعلقات کی دیوی ہونے کے سبب قدرتاً وہ عشاق اور عورتوں میں بہت مقبول تھی۔ وہ تمناؤں کو بر لانے والی سمجھی جاتی تھی اس لیئے حرماں نصیب اس سے دُعائیں مانگا کرتے چنانچہ ایک عورت اس سے یُوں ملتجی ہوتی ہے کہ اس کا —

"شوہر بخیریت لوٹ آئے، بدستور اس سے محبت کرتا رہے اور
اور وہ (عورت) بچے پیدا کرتی جائے"

عشتار جنسی جذبہ کو ابھارتی ہے

"میں وہ ہوں،
کہ نر کو مادہ کی طرف مائل کرتی ہوں
میں وہ ہوں
کہ مادہ کے لیے نر کو کشش انگیز بناتی ہوں۔

اور میں وہ ہوں،
کہ مادہ کو نر کے لیئے نکھار دیتی ہوں —"
ایک اور جگہ کہتی ہے :
"جب میں شراب لے کر بیٹھتی ہوں تو ایک جاں نثار کے لیئے
(وقف) ہوتی ہوں —"

وہ اپنے آپ کو ڈیرے دار رنڈی تک کہہ جاتی ہے۔
چنانچہ ان عقائد و تصوّرات سے عام اخلاقی زندگی بُری طرح متاثر ہوئی۔ در اصل اس کے مندروں کی داسیوں کی وجہ سے عام شہری بہت اثر پذیر ہوئے۔ اس کے مندروں میں بے شمار نہایت خوبرو اور نوعمر کنواریاں رکھی جاتیں اور ان کے ساتھ مرد پروہت بھی رہتے تھے۔ عشتار کی یہ داسیاں مختلف ناموں سے جُداگانہ فرقوں میں بٹی ہوئی تھیں:

۱۔ قَادِشْتُ — بمعنی مقدّس۔ اچھوتی'
۲۔ عِشْتَارَتُ — " 'عشتار کو نذر کی ہوئی'
۳۔ خَرِمْتُ[1]
۴۔ کَذِرِتُ — 'لبھانے والی'
۵۔ اُخَاتُ —
۶۔ شَامحَاتُ — " 'متبسّم کنواری'

---

[1] بابلی زبان کا یہ لفظ عربی کے 'محرم' کے مترادف ہے۔

حموربی کے قانون میں عشتار کی ان اچھوتیوں سے متعلق متعدد دفعات ہیں۔

ان داسیوں کو سماج میں بہت اونچا درجہ حاصل تھا اور "مہاپجارن" کی مقبولیت اور اقتدار بے پناہ تھا۔ جب تک یہ مرد عورت مندروں سے وابستہ رہتے، شادی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ ابتداً یہ کنواریاں عصمت مآب ہوتی تھیں لیکن بعد میں آن کر ان میں بھی وہی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو آگے چل کر عیسائی راہباؤں اور ہندو دیوداسیوں میں پائی جاتی ہیں۔ دراصل شادی نہ کر سکنے لیکن نوعمر اور شکیل مرد و عورت کی بیکاری کے عالم میں ہر وقت کی یکجائی کے یہ نتائج پیدا ہونے ہی چاہئیں تھے۔ چوں کہ ان کی دیوی بھی متعدد عشق لڑا چکی تھی، اس لیئے عشتار کی یہ اچھوتیاں اپنی "ہرجائی ربہ" کے طرزِ عمل کو جواز بنا کر عارضی طور پہ مرد ساتھی رکھ لیتی تھیں اور پھر ان کی اس روش کا اثر شہری خواتین بھی قبول کر گئیں۔ رفتہ رفتہ بہت سے مقامات پہ اس کی پرستش ہمارے نقطۂ نگاہ سے بڑے ہی غیر اخلاقی اور شرمناک انداز میں ہونے لگ گئی تھی لیکن بعض لوگ اس حرام کاری کو مقدس اور مذہبی رو سے ضروری خیال کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس اس سلسلے میں بڑی تفصیل سے لکھتا ہے:

"بابلیوں میں ایک بہت ہی شرمناک رسم جاری ہے۔ ہر عورت کو ایک خاص مذہبی رسم کی انجام دہی کے لیئے زندگی میں کم از کم

ایک مرتبہ بن سنور کر عشتار کے مندر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ مرد وہاں آ کر پسندیدہ عورت کی گود میں چاندی کا سکہ ڈالتا ہے اور عورت اُس کی شریکِ بستر ہونے کو ساتھ ہو لیتی ہے۔ سکہ خواہ کتنا حقیر بھی ہو عورت کا اس کے قبول کرنے سے انکار گویا قانون شکنی کے مترادف ہے۔ کیوں کہ یہ متبرک ہوتا ہے اور جب تک وہ اس فریضہ کی تکمیل نہیں کر لیتی گھر نہیں لوٹ سکتی۔ گھر چلے آنے کے بعد پھر اسے کسی بھی قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا ہے۔ حسین عورت کے برعکس قبول صورت یا بدصورت عورتوں کو اس قانونی شرط کے پورا کرنے کی خاطر بعض مرتبہ تین تین سال مندروں میں گزارنا پڑ جاتے ہیں (کیوں کہ ان کے گاہک بہت دیر کے بعد پیدا ہوتے تھے) ایسا ہی رواج قبرص میں بھی موجود ہے ــــــ"

یہ تو خیر ظاہر ہے کہ اس مقدس حرام کاری سے ہیروڈوٹس نے ہر شریف کنواری کو ملوث کر کے بڑی زیادتی سے کام لیا ہے لیکن اس کے اور بائبل کے بیانات سے اس زمانے کی عام اخلاقی حالت کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے جو عشتار کے نام پر ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے تہواروں پر ہر جگہ بڑی بے باکی سے بداخلاقیوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

مذاہب پر اس کا اثر | عشتار کی پوری تاریخ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے بعض الہامی اور دیگر عظیم مذاہب اور مختلف قوموں کے رسم و رواج اور روزمرّہ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ موجودہ یہودیت، نصرانیت اور ہندو مت اس سے بہت متاثر ہیں۔

یہودیّت | بائبل کی متعدد آیات سے بنی اسرائیل میں اس کی مقبولیّت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اتنے انبیاء کرام اور مصلحین کی آمد اور قانونِ موسوی اور صحیفۂ داؤدی کی امین ہونے کے باوجود یہ گم کردہ راہ اسرائیلی عشتار سے متعلقہ فرائض اور رسوم بڑے خلوص اور سرگرمی سے بجا لاتے تھے اور ان کا ایمان ہو گیا تھا کہ عشتار سے روگردانی کی سزا گرفتاریِ مصائب و آلام ہے۔

"اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل و عستارات کی پرستش کرنے لگے"

(قضاۃ ۲/۱۳ ۱۴۲۵ ق۔م)

"اور سموئیل نے بنی اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کر دو۔"

(سموئیل ۷/۳ ۔ ۱۱۴۰ ق۔م)

اور اس بائبل کی رُو سے تو نہ صرف یہ کہ حضرت سلیمانؑ کی ایک بیوی

ہی عشتار کی پجارن تھی بلکہ (نعوذ باللہ) خود حضرت سلیمان بھی عشتار کے عقیدت مند تھے۔ بائبل کے بیان کے مطابق اس کے لیئے انھوں نے ایک معبد بھی بنوایا تھا جسے بعد میں یسعیاہ بادشاہ نے ڈھا دیا تھا۔

"..... کیوں کہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیوں کے نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا۔"

۱۔ سلاطین ۵/۱۱ ۹۹۲ سنہ ق۔م

اسرائیلی برابر عشتار کے لیئے نذریں گزارتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے:

"پس تو ان کے لیئے دعا نہ کر...... کیا تو نہیں دیکھتا کہ یہوداہ کے شہروں میں اور یروشلم کے گلی کوچوں میں وہ کیا کرتے ہیں۔ بچے لکڑی جمع کرتے ہیں اور باپ آگ سلگاتے ہیں اور عورتیں آٹا گوندھتی ہیں تا کہ آسمان کی ملکہ (عشتار) کے لیئے روٹیاں پکائیں اور غیر معبودوں کے لیئے تپاون تپا کر مجھے غضب ناک کریں۔"

(یرمیاہ ۷/۱۸-۱۶ سنہ ۶۰۰ ق۔م)

بنوکدنصر (بخت نصر) کے حملۂ یروشلم کے باعث کچھ اسرائیلی بھاگ کر جب مصر پہنچے تو یرمیاہ نبی نے انھیں تنبیہہ کی کہ غیر معبودوں کی پرستش کی سزا خداوند تمھیں یہاں بھی دے گا لیکن اس تنبیہہ کے باوجود اسرائیلیوں نے عشتار کے متعلق بڑے جوشِ عقیدت کا مظاہرہ کیا۔

بلکہ اپنے آلام کا سبب ہی عشتار سے بے تعلقی کو ٹھیرایا۔

"بلکہ ہم تو اسی بات پر عمل کریں گے جو ہم خود دیکھتے ہیں کہ ہم آسمان کی ملکہ کے لیئے بخور جلائیں گے اور تپاون تپائیں گے۔ جس طرح ہم اور ہمارے باپ دادا اور ہمارے بادشاہ اور ہمارے سردار یہوداہ کے شہروں میں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس وقت ہم خوب کھاتے پیتے اور خوشحال اور مصیبتوں سے محفوظ تھے۔ پر جب سے ہم نے آسمان کی ملکہ کے لیئے بخور جلانا اور تپاون تپانا چھوڑ دیا۔ تب سے ہم ہر چیز کے محتاج اور تلوار اور کال سے فنا ہو رہے ہیں۔"
(یرمیاہ ۴۴/۱۸،۱۷ ، ۵۸۲ ق۔م)

بائبل کے محققین کی نکالی ہوئی مذکورہ حوالوں کے ساتھ مندرجہ تاریخیں گو دیگر علماء کی متعین کردہ تاریخوں سے مطابقت نہیں رکھتیں تاہم ان تاریخوں سے اسرائیلیوں میں عشتار کی مقبولیت، کے عرصہ اور تسلسل کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔

متعدد علماء اس امر پر متفق ہیں کہ بائبل میں استر کی جو کہانی ہے وہ دراصل عشتار سے لی گئی ہے۔ جے ہیوٹ ( ) کے خیال میں یہ واقعہ دراصل چاند دیوی (عشتار) کی گیارہ شیطانوں پر فتح کی اس روایت سے ماخوذ ہے جو مختلف قوموں، یہاں تک کہ ہندوستان کے گونڈوں میں بھی مشہور تھا۔ یہودزادی استر دراصل عشتار جس نے قدیم روایتوں کے

بموجب عیلام کے صوبہ 'شوشن' کے حکمران عیلامی دیوتا 'سوسی ناگ' کی ملکہ بن کر اس کی تورانی بیگم وشتی کو بے دخل کر دیا تھا۔ بائبل کا ہامان بعض کے نزدیک عیلام کا قومی معبود ہومان یا ہماان ہے لیکن ہیوٹ کی رائے میں ہامان اور اس کے بیٹے قدیم روایتی شیطان ہیں۔ استر کا ماموں مردکی در اصل مشہور بابلی دیوتا مردوخ یا مردوک ہے جس کی امداد سے عشتار مذکورہ شیطانوں پر غالب آئی تھی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عبرانی میں مردکی کے کچھ بھی معنی موجود نہیں ہیں — وشتی، قصر سوسن اور شاہ اسویرس علی الترتیب، عیلامی دیوی وشتی، صوبہ شوشن اور عیلامی دیوتا سوسی ناگ (پاک و ہند کا شیشن ناگ) ہیں۔

عشتار اور عیسائیت

یہودیت کی نسبت نصرانیت عشتار سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ در اصل عیسائی مذہب کے آغاز بلکہ اس کے کافی بعد تک بھی عشتار کو عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی اور اس کی یہ مقبولیت ہی عیسائی مبلّغین اور عیسائیت کی تبلیغ و توسیع کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ عشتار کے متعلقہ شاندار اور خیرہ کن رسمیں اور عقیدے پجاریوں کی مذہبی ولولہ انگیزی اور والہانہ پن، اس کے نام پر قربان کیئے ہوئے بیل کے خون سے بپتسمہ دے کر لوگوں کو حیاتِ نو، اور ہدایت و رشد عطا کرنے کا اعزاز، آراستہ پیراستہ عظیم الشان مناور اور نو عمر و خوبرو کنواریوں کی موجودگی، ان سب چیزوں میں عوام کے لیئے ایسی جاذبیت اور کشش تھی کہ لوگ پروانہ وار ادھر کھچے چلے

آتے تھے ــــ ادھر روکھی پھیکی، ابتدائی عیسائیت ان سب چیزوں سے کلیتہً محروم تھی۔

بالآخر عیسائی راہنماؤں کو مجبوراً وہی کچھ اختیار کرنا پڑا عوام جس کے شیدائی تھے۔ رسم بپتسمہ کو انہی عقائد کے ساتھ اپنا لیا گیا، معبدوں کی زیب و زینت پر توجہ دی گئی۔ مریمؑ اور ابن مریمؑ کو مصوری اور مجسمہ سازی کے ذریعے طرح طرح کے روپ میں پیش کیا گیا۔ خانقاہوں اور گرجاؤں میں راہبائیں رکھی گئیں جنھیں عشتار کی داسیوں کی طرح شادی کی قطعاً اجازت نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عشتار کا زور توڑنے کی خاطر، عیسائی علمائے نے عشتار سے متعلقہ نظریہ تثلیث بھی اپنا لیا۔ مصریوں کی سب سے بڑی تثلیث آئسس (عشتار) اس کے محبوب شوہر اوزیرس اور ان کے بیٹے حورس پر مشتمل تھی۔ اسی سے عیسائیوں نے اپنا تثلیث کا عقیدہ مستعار لیا۔ مصر کے متبرک اور پُراسرار جزیرے ’فلی‘ میں اوزیرس کا ایک بہت بڑا مندر تھا۔ یہیں حورس پیدا ہوا تھا۔ عیسائی بھی اس کی تعظیم کرتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ وہاں حضرت مریمؑ کا ایک گرجا بنا کر حضرت مریمؑ اور آئسس، عیسیٰؑ اور حورس کو (نعوذ باللہ) ایک ہستی قرار دے دیا۔ یہیں پر بس نہیں حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو جانے کا قصہ بھی بابلی حکایتوں سے اخذ کر لیا گیا (قرآن کی رُو سے آپؑ کو صلیب نہیں دی جا سکی) تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آیا جب بابلی دیوتا مردوخ یا بعل کو تموز کہ قرار دے لیا گیا۔ بابلیوں کا خیال تھا کہ سال کے

نئے تہوار کے موقعہ پر بعل پاتال میں قید ہو گیا تھا۔ بعل کے ساتھ ایک مجرم بھی قتل کیا گیا۔ بعل کو ایک قبر میں رکھا گیا اور ایک پجارن اس کی قبر پر روئی قبر سے وہ جلد ہی باہر آگیا اور بعل و مقتول مجرم ساتھ ساتھ پاتال میں اُتر گئے قریباً بالکل یہی بیان انجیلوں کا ہے۔ انجیل یوحنا کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ دو مجرم مصلوب ہوئے۔ آپ کو ایک قبر میں رکھا گیا اور مریم مگدلینی قبر کے پاس کھڑی روتی رہی۔ پھر آپ قبر سے باہر آگئے اور آسمان پر چلے گئے۔

'ایسٹر' اور 'گڈ فرائڈے'، وغیرہ سے متعلقہ عقائد و رسوم عشتار کی ہی روایات سے لیئے گئے ہیں۔ غرض اس طرح عشتار ہی کی خصوصیات اپنا کر عیسائیت کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا — اور رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب عیسائیوں کو سیاسی برتری حاصل ہو گئی۔

ہندو مت بہت قدیم زمانوں سے مادرِ مشفق یا عشتار کی ایک مخصوص پوجا پاکستان میں ہوتی چلی آرہی تھی۔ ہندوؤں کی 'شکتی پوجا'، اسی سے نکلی۔ پاکستان کی اس قدیم پوجا سے متعلقہ نظریات سے بہت مشابہ عقائد دورِ آریہ سے بہت قبل مشرقِ قریب میں پھیلے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں ماتا دیوی اور اس کے محبوب کا تصور بھی ہندو ازم میں فسانہ عشتار و تموز سے آیا اور جیسا کہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ اسی اثر کا نتیجہ ہندوؤں کا سب سے بڑا تہوار 'دسہرہ' ہے۔

ہندوؤں خصوصاً ہندوستان کی دیہاتی آبادی کی مقبول ترین معبود آج بھی ماتا دیوی یا عشتار ہی ہے اور کالی، درگا اور پاربتی وغیرہ کے روپ برابر عشتار پوجا ہو رہی ہے اور درگا پوجا تو اب بھی بنگالیوں کا مقبول ترین تہوار ہے۔

لہ عشتار کے لیے کہیں اور انسانی قربانی دی جاتی ہو یا نہ ہو لیکن ہندو اب بھی انسانی خون اسے پیش کر دیتا ہے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں ۷ ار نومبر ۱۹۵۵ء کو کلکتہ میں کالی کے ایک عقیدت مند نے 'کالی کی جے' کا نعرہ مارا اور پجاری کی گردن اس وقت اڑا دی جب پجاری 'دیوی' کے سامنے رسوم ادا کر رہا تھا۔ حملہ تو اس پرجوش عقیدت کیش نے دوسرے پروہت پر بھی کیا لیکن حسنِ اتفاق سے وہ بچ نکلا۔
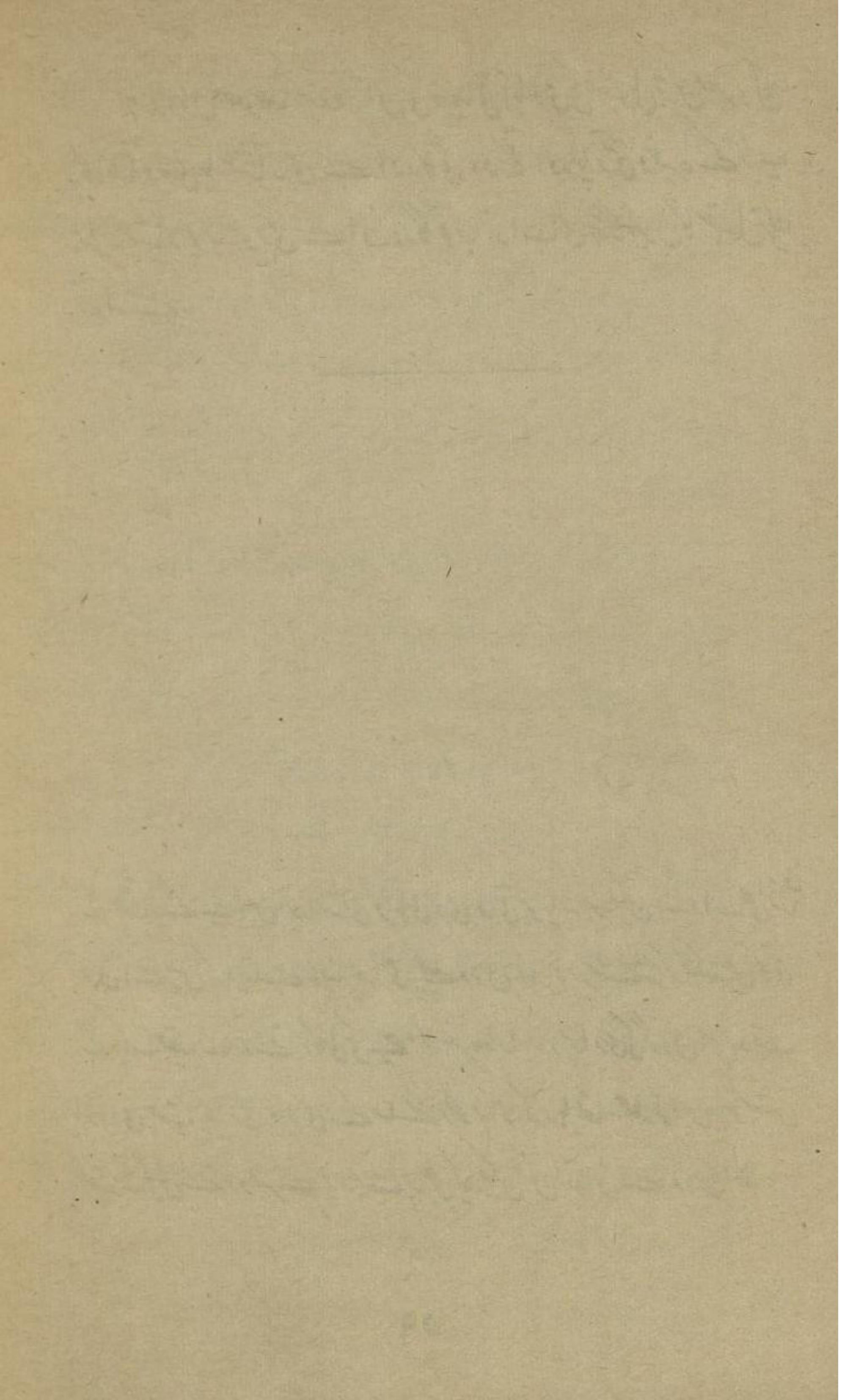
طوفانِ نوحؑ

طوفانِ نوحؑ

دُنیا میں کوئی اور روایت ایسی نہیں ہے جو ازمنۂ قدیم سے لے کر اب تک اس قدر عالم گیر حیثیت رکھتی چلی آ رہی ہو، جتنی کہ کسی بہت بڑے طوفان کی روایت ہے۔ یہ طوفانی حکایت، دنیا کی اکثر و بیشتر قوموں اور ملکوں میں عموماً بنیادی ہم آہنگی لیے کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے۔

عراق میں پچھلی اور موجودہ صدی میں لایارڈ اور وولی کی اثریاتی کھدائیوں سے پہلے ہمارے پاس طوفانِ نوحؑ کے بارے میں جو کچھ مواد تھا وہ یا تو الہامی اور مذہبی کتب یعنی قرآن مجید، بائبل، مہابھارت اور پرانوں کے بیانات اور پرانے لوگوں مثلاً بروسیس[1] پر مبنی ہے یا پھر مختلف قوموں میں سینہ بسینہ چلی آنے والی حکایات میں پایا جاتا ہے لیکن گزشتہ اور موجودہ صدی میں ایسے متعدد قدیم کتبے عراق سے مل گئے ہیں جن پر کسی بہت بڑے طوفان کے واقعات درج ہیں۔

---

[1] بروسیس ۳۲۳ ق۔م یعنی سکندر کا ہم عصر ایک بابلی مؤرخ تھا جس نے یونان میں بیٹھ کر بابلی حکمرانوں کی ایک تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ در اصل مسیح سے دو ہزار سال پہلے کی بابلی اور سومیری تحریروں کو ماخذ بنا کر لکھی گئی تھی۔

۱۸۵۱ء میں سر اے، ایچ - لایارڈ
نے عراق کے مشہور شہر اور شاہانِ اشور کے پایہ تخت نینوا کی کھدائی[1] شروع کی
جو بعد میں جان، پی، پیٹرز ایچ - وی - ہل
اور ڈاکٹر ہنری ہینز
کی سرکردگی میں تھوڑے وقفے سے ۱۹۰۰ء تک جاری رہی - یہاں
سے اشوری حکمران سنجریب $\frac{705}{681}$ ق - م کے نامور پوتے اشور بنی پال
$\frac{669}{626}$ ق - م کا رفیع الشان محل نکلا اور اسی محل سے اس کی مشہور زمانہ لائبریری[2]
برآمد ہوئی - یہاں سے پچیس ہزار سے کچھ زیادہ "کتابیں" نکال کر یورپ
پہنچا دی گئیں - یہ کتابیں مٹی کی پتلی پتلی اینٹوں پر لکھی ہوئی ہیں - یہیں سے وہ

---

[1] کلدانیہ کا مشہور قدیمی شہر موجودہ موصل کے قریب دجلہ کے کنارے آباد تھا - آج کل نینوا کے کھنڈرات کو کوینجک کہتے ہیں -

[2] اشور بنی پال کی اس مشہور زمانہ لائبریری کی اہمیت اور شہرت کا راز ان کتبوں اور نوشتوں میں مضمر ہے جو مندروں وغیرہ میں رکھے جاتے تھے - بابل کے مندر خصوصاً علمی مراکز تھے - یہ کتبے دراصل ان شرحوں اور تنقیدوں پر مشتمل تھے جو قدیم واقعات کی از سر نو تحریر و تدوین کے سلسلے میں کی جاتی تھیں - ان مندروں میں علماء اور پروہت ان نوشتوں کو پڑھتے اور ان پر تنقیدیں کرتے اور شرحیں لکھتے تھے - اسی علمی و ادبی ذخیرہ کو اکٹھا کر کے اشور بنی پال اپنی عظیم الشان لائبریری قائم کر سکا -

بارہ اینٹیں بھی نکلیں جن پر قدیم بابلی ہیرو جلیج موس (اسے گلگامیش بھی لکھا جاتا ہے) سے متعلقہ مشہور رزمیہ داستان لکھی ہے۔ ان ہی میں سے دو تختیوں پر ایک بہت بڑے طوفان کا قصہ بڑے ہی مؤثر پیرائے میں درج ہے

۱۹۱۰ء میں عراق کے قدیم شہر نپور سے ایک اور قدیم ٹکڑا ہاتھ آیا گو اس کے مسخ شدہ حصوں میں سے صرف چند سطور باقی رہ گئی ہیں اور مضمون میں کسی خاص شخص کا نام بھی نہیں ہے لیکن یہ امر قطعاً واضح ہے کہ اس پر طوفان کی بابلی روایت مرقوم تھی۔ نپور والا یہ کتبہ اس وقت کا ہے جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے اُر میں اپنے گھر کو ابھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان مختلف طوفانی تختیوں کے علاوہ سیلاب عظیم کی روایت سے ہی متعلقہ دو اور کتبے ملے ہیں ان میں سے ایک تو بابل کے پہلے شاہی خاندان کے آخری نصف دور کا ہے اور دوسرا اس سے بھی پہلے کا ہے۔ غرض اس طرح طوفانِ نوحؑ کے متعلق قدیم ترین تحریری ورثہ بھی ہاتھ آ گیا۔

عراق کے اس قدیم طوفان کو داستانِ جلیج موس میں بالتفصیل بیان کیا

ؔ بابلی ہیرو جلیج موس کی یہ داستان تاریخ کی سب سے اہم، مشہور و دلچسپ رزمیہ داستانوں میں سے ہے۔ یہ طویل منظوم داستان بارہ تختیوں پر پھیلی ہوئی ہے اور ماہرین کے محتاط اندازے کے مطابق کوئی تین ہزار سطور پر مشتمل ہے۔ ہر تختی پر ایک واقعہ یا قصہ درج ہے جس سے جلیج موس بالواسطہ یا بلاواسطہ متعلق ہے (بقیہ اگلے صفحے پر)

گیا ہے۔ اس موقعہ پر ہم اسی کو مدِ نظر رکھیں گے۔ اس داستان کی گیارھویں اور بارہویں اینٹوں پر یہ واقعہ مندرج ہے۔ یہ تختیاں غالباً ۶۶۰ ق۔م میں لکھی گئی تھیں لیکن ان پر جو مضمون درج ہے وہ کم از کم دو ہزار قبل مسیح کی کسی نظم سے لیا گیا ہے اس کی توثیق ایک اور مسخ شدہ کتبے سے ہوتی ہے جو کو ابوجبہ کے مقام سے ملا تھا اور جس پر یہی طوفان کی کہانی لکھی ہے۔ اس کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۲۲۵۰/۲۱۵۰ ق۔م کے درمیان کسی وقت رقم کیا گیا۔

گروٹن فنڈ، ہنری رالنسن، برنوف، لیسن اور اوپرٹ کی قدیم سومیری رسم الخط کو پڑھنے کی قابلِ قدر اور کسی حد تک کامیاب کوششوں کے بعد بالآخر ۱۸۷۲ء میں برٹش میوزیم کے جارج سمتھ اس عبارت کو پڑھنے میں کامیاب ہو ہی گئے جو جلجموس کی داستان سے متعلق ہے[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵) لیکن ان تختیوں میں بعض انددادِ زمانہ کے باعث مسخ ہو کر اس قدر نامکمل اور خستہ حالت میں ہیں کہ ان کا مضمون مشکوک ہو گیا ہے۔ چھٹی اور گیارھویں تختی سب سے عمدہ حالت میں ہے۔ نویں اور دسویں پر جلجموس کے اُت ناپشتم کو ڈھونڈنے کے واقعات ہیں۔ یہ اینٹیں آج کل برٹش میوزیم لندن میں ہیں۔

[1] ان قدیم کتبوں اور کلدانی، سامی اور پارسی زبانوں کو پڑھنے میں شروع شروع میں علماء کو بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر مشہور جرمن محقق گروٹن فنڈ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۶۷)

سومیریوں کی یہ طوفانی روایت ابتدا میں بڑے سیدھے سادے پیرائے میں بیان ہوئی تھی لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بہت کچھ اضافہ ہوتا چلا گیا بالکل اسی طرح جس طرح کہ رامائن اور مہابھارت میں ہوا اور اب یہ ۱۷۰ اسطور پر مشتمل ہے۔ جلجامش کے زمانے بلکہ اس کے بعد تک اس قدیم طوفان کی ہلاکت آفرینی کو بھولے نہیں تھے اور یہ داستان نسلاً بعد نسلٍ حافظوں میں محفوظ چلی آ رہی تھی۔

طوفانِ نوحؑ سے متعلق یہ قدیم بابلی قصہ تا حال سب سے قدیم ہے اور متعدد علماء کے خیال میں بائبل میں طوفانِ نوحؑ کے متعلق جو واقعہ ہے وہ بھی اسی قدیم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶) نے چند علامتوں کی آوازوں کو معلوم کر لیا اور اس ابتدائی مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد کسی قدر آسانی ہو گئی۔ ہوا یہ کہ اس نے کچھ مختلف علامتیں متعدد جگہوں پر ایک ہی قسم کی پائیں۔ اس سے اس نے قیاس کیا کہ یہ بادشاہوں کے نام ہو سکتے ہیں غرض ان فرمانرواؤں کے نام پڑھ لینے سے بقیہ حروف کو پڑھنے میں بہت کچھ آسانی ہو گئی۔ سہری رالنسن اور ان کے بعد برنوف، لیبسن اور اوپرٹ وغیرہ نے ان قدیم زبانوں کو پڑھنے میں بہت محنت سے کام لیا۔ مگر ان تحقیقاتی مراحل میں لایارڈ سب سے بازی لے گیا ـــ پھر سارگن دوم کے مشہور مذہبی کتب خانہ (واقعہ ارتخ) سے جو کتب ملیں ان میں سے متعدد کتابیں گرامر اور لغات کی بھی تھیں۔ ان سے عراق کی قدیم ترین تحریری زبان کو پڑھنے میں بہت مدد ملی جن میں ہی یہ داستانِ جلجامش بھی لکھی ہے۔

بابلی قصہ سے اخذ کیا گیا ہے اور اسی بابلی واقعہ کو دیگر بہت سی اقوام نے اپنا لیا۔ اسی لیئے اس روایت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

قصۂ طوفان
پانچ ہزار سال قبل

"داستانِ جلج موس" میں اس روایت کی شانِ نزول دراصل یہ ہے کہ تخلیق و محبت کی دیوی عشتار کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر بابلی ہیرو جلج موس آبِ حیات یا ابدی زندگی کا راز معلوم کرنے کو اپنے مورثِ اعلیٰ اُت ناپشتم کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اُت ناپشتم کو دیوتاؤں نے غیر فانی بنا دیا تھا اور وہ دریاؤں کے سنگم کے قریب رہتا تھا۔ بصد مشکل جب جلج موس، اُت ناپشتم کے پاس پہنچا تو اُت ناپشتم یوں گویا ہوا۔

"اے جلج موس،
میں تجھے وہ عظیم کہانی سناؤں گا
اور دیوتاؤں کا فیصلہ بتلاؤں گا۔
شہر شُرپیک[1]،
جسے تو جانتا ہی ہے، فرات کے کنارے ہے،
اس شہر والے بد کردار ہو گئے،
اس لیئے وہاں کے دیوتاؤں نے،

---

[1] شُرپیک موجودہ "فارہ" کے قریب تھا یہاں کھدائی ہو چکی ہے۔

اس پر بارش کا طوفان نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
تمام عظیم دیوتا،
اُن کا باپ آنو، اُن کا مشیر جنگجو بعل،
اُن کا ایلچی ننِب، اُن کا سربراہ انونا گی
دیوتاؤں کی ملکہ عشتار،
اور عقل و دانش کا مہربان آقا، آیا بھی ان کے ساتھ تھا۔
آیا نے ان کے فیصلہ کی اطلاع سرکنڈوں کی جھونپڑی میں کر دی۔
"سرکنڈے کی جھونپڑی — سرکنڈے کی جھونپڑی،
مٹی کی دیوار — مٹی کی دیوار،
او سرکنڈے کی جھونپڑی سُن،
او مٹی کی دیوار کان دھر،
اے شرُیپک کے انسان[1]، — اوبر توت کے بیٹے[2]،
ایک جہاز بنا،
اپنا سامان چھوڑ دے اور خاندان کو بچا،
اپنی املاک کو دفع کر اور جان بچا۔
جہاز میں بیوی بچے اور ہر جاندار کا بیج اور اناج لاد لے۔"

---

[1] اُت ناپشتم سے مُراد ہے [2] اوبر توت کا ایک نام کدن مردوک بھی پڑھا گیا تھا۔

میں نے آیا کا حکم سُنا اور سمجھ گیا
پھر میں نے اسے کہا،
"اے دانش ور دیوتا،
جو کچھ تُو نے کہا وہ تو میں کروں گا،
لیکن اپنے اس فعل کا،
اُن پیر فرتوتوں،
اُن چھوکروں کو کیا جواب دوں گا،
جو میرا تمسخر اُڑائیں گے۔"
آیا ایک بار پھر یوں گویا ہُوا:
"تو ان سے کہیو،
خشکی کا دیوتا انلیل مجھ سے خفا ہو گیا ہے
میں اب شہر میں نہیں ٹھہر سکتا،
میں اب انلیل کی سرزمین میں اپنا مُنہ نہیں دکھا سکتا،
میں پانیوں کے دیوتا آیا کی قلمرو میں جا رہا ہوں.
اپنے آقا آیا کے ساتھ رہنے کو،
تم پر ایک بارش کا طوفان آئے گا،
آدمی، درندے، پرندے، سب فنا ہو جائیں گے۔
شمش دیوتا نے آسمانوں سے تباہی لانے کا وقت مقرر کر دیا ہے،

جو (تنہا ہی طوفان کا دیوتا) رمّان لائے گا۔"
میں نے جہاز بنایا۔
اُس کی چھ منزلیں تھیں اور سات درجے،
(اور ہر منزل کے) نو حِصّے،
میرے پاس جو کچھ تھا اس میں بار کر لیا،
سب چاندی — سارا سونا
ہر زندہ جانور،
کھیتوں کے مویشی — میدان کے درندے، کاری گر
سب کچھ جہاز پر رکھ لیا،
جب رمّان — عذاب لانے والا تھا
میں نے زمین پر نظر دوڑائی، میں سہم گیا
جہاز کا دروازہ بند کر لیا
پُزر شادی رابی کو جہاز ران بنا دیا
سُورج کی پہلی کرن کے ساتھ،
اُفق پر کالی گھٹا لہرائی،
رمّان گرجا،
نیبو، نرجل اور شارو (مردوخ) تیزی سے آگے بڑھے
غضب ناک ننب آگے آیا اور حملہ کا حکم دے دیا۔

انوناگی نے مشعلیں روشن کیں ،
ان کے نور سے کائنات جگمگا گئی ۔
رمان کا طوفان افلاک پر چھایا
تو ہر سُو تاریکی چھا گئی
اراسے نے بادبان نوچے ،
تمام دن پانی پڑا — دریا چھلک اُٹھے ۔
افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم ،
بھائی سے بھائی اور دوست سے دوست بیگانہ
دیوتا سہم کر آسمانوں میں بھاگے ،
اور آنو کے سب سے اونچے آسمان میں جا چھپے ،
دیوتاؤں کی ملکہ — بلند مرتبہ دیوی عشتار
دردِ زہ میں مبتلا عورت کی طرح چلّائی
"تمام دُنیا تباہ ہوگئی — سب کچھ مٹی میں مل گیا ۔
یہ اس لیئے ہُوا کہ میں دیوتاؤں کی شیطانی مجلس میں شریک ہوگئی ،
افسوس ! میں نے اپنی مخلوق کی تباہی کی اجازت دی ۔
اس دن پر لعنت ،
جب میں نے دیوتاؤں کے فیصلے پر صاد کیا ،
کاش میں لوگوں کی سزا کے لیئے جنگ کا فیصلہ دیتی ۔

انسانوں کو اس لیئے میں نے پیدا نہیں کیا،
کہ سمندروں کو مچھلیوں کی طرح اُن سے بھر دیا جائے۔"
روحیں بھی لب بستہ عشتار کے ساتھ محوِ گریہ تھیں،
انوناگی اور دوسرے دیوتا بھی سروں پہ ہاتھ رکھے،
عشتار کے ساتھ رونے لگے۔

چھ دن اور چھ راتیں بیت گئیں،
پانیوں نے زمین کو ڈھانپ لیا۔
ساتویں دن طوفان کا زور ٹوٹا، ہوا تھمی
اُبلتا پانی پُرسکون ہوا — سمندر لوٹ گیا
میں نے روتے روتے کھڑکی کھولی،
روشنی یکلخت میرے مُنہ پہ پڑی، میں زور سے چلّایا،
لیکن سب لوگ مٹی ہو کر رہ گئے تھے۔

میں بیٹھ گیا اور رو دیا
پانی اُترنے لگا
کشتی "نِصِر" پہاڑی پہ جا لگی۔

چھ دن بیتے،
ساتویں دن ایک فاختہ اڑائی۔
کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لوٹ آئی؛

پھر ابابیل چھوڑی، وہ بھی ناکام پھری،
کوّا بھیجا — اُسے زمین ملی پر آپ نہیں لوٹا،
پھر سب پرندے چاروں طرف اڑا دیئے۔
'میں نے پہاڑ کی چوٹی پر قربانی چڑھائی۔ سات مقدس انگیٹھیوں
کے نیچے مہندی، نرسل اور دیودار کی لکڑی رکھی۔ عود اور
لوبان جلائے۔ قربانی کی خوشبو جو سونگھی تو دیوتا مکھیوں
کی طرح آن جمع ہوئے۔
عشتار کفِ افسوس ملتی، اپنے باپ کی دی ہوئی ہیروں کی مالا
کو اٹھا کر قسم کھاتی تھی۔
"آہ یہ دیوتا!
میں ان دنوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ سب دیوتاؤں کو آنے دو،
لیکن بعل کو نہیں۔ کیوں کہ اس نے میرے مشورے اور نصیحت کو
نظرانداز کر دیا — اور یہ وہی تو ہے جس نے خوفناک طوفان بھیج کر
میری مخلوق تباہ کر دی۔"
لیکن بعل آیا تو جہاز کو دیکھ کر دیوتاؤں پہ برس پڑا۔
"ایک بچ نکلا؟
فیصلہ ہو چکا تھا کہ کوئی نہیں بچے گا"
بعل کا بیٹا ننب بولا:

"یہ سب کچھ آیا نے کیا ہے۔ وہی سب کچھ جانتا ہے۔
آیا نے لب کھولے اور جنگجو تعل سے بولا :
" تُو دیوتاؤں کا محارب رہنما ہے، بے شک تو سالارِ اعظم ہے اور
دیوتاؤں کا قوتِ بازو بھی، لیکن بے سوچے سمجھے ایسا شدید طوفان
لانے کا سبب ؟ تُو گناہگاروں اور شیطانوں کو ان کے اعمال
کی سزا ضرور دے لیکن اتنا مہربان تو بن کہ سب کچھ تباہ نہ کر۔
طوفان کی جگہ،
شیروں، چیتوں کو چھوڑ دیتا کہ وہ انسانوں کو کم کر دیتے
طوفان کی جگہ،
قحط نازل کرتا کہ زمین مصیبت میں مبتلا ہو جاتی،
طوفان کی جگہ
ارا[1] کو حکم دیتا کہ آبادی کم ہو جاتی،
اور میں نے تو ارباب عظیم، کے فیصلے کا انکشاف نہیں کیا بلکہ میں نے تو
اوراخاسس[2] کو صرف، ایک خواب دکھلایا تھا اور اسی سے وہ سب کچھ
سمجھ گیا"
یہ سب کچھ سُن کر تعل کا غصہ دھیما ہوا۔ جہاز میں آیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا
میری بیوی کو لا کر میرے پہلو میں گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا۔ ہمارے درمیان

---

[1] وباؤں کا دیوتا۔ اس کا ایک نام دبارا بھی ہے [2] اُت ناپشتم کا دوسرا نام

کھڑے ہو کر ہمیں برکت دی اور بولا:

"اُت ناپشتم ایک انسان تھا لیکن اب اُت ناپشتم اور اس کی بیوی دیوتاؤں کی طرح ہوں گے۔ اُت ناپشتم اب دریاؤں کے سنگم کے قریب رہے گا۔"

پھر وہ مجھے یہاں دریاؤں کے اتصال کے قریب چھوڑ گئے۔"

اس قدیم بابلی حکایت اور دیگر الہامی روایتوں کے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نمایاں اگر فرق ہے تو یہ کہ وہاں وحدانیت ہے اور یہاں بہت سارے دیوتا موجود ہیں۔ ورنہ عقیدہ اُن لوگوں کا بھی یہ تھا کہ بُروں کو ہمیشہ اُن کے کیئے کی سزا ملتی ہے اور نیک لوگ خدا کے برگزیدہ اور پیارے ہوتے ہیں۔ یہاں حضرت نوحؑ ہیں اور وہاں اُت ناپشتم، یہاں جودی، اراراط کی پہاڑیاں ہیں جن پر کشتی ٹھیری تھی اور وہاں پہاڑی کا نام 'نصر' ہے۔ زمین کی تلاش کے لیئے حضرت نوحؑ کی طرح پرندے اُت ناپشتم بھی چھوڑتا ہے۔ ادھر نوحؑ کو بذریعہ وحی طوفان آنے کی اطلاع دی جاتی ہے اور اُدھر ایا دیوتا اُسے سب کچھ بتلا دیتا ہے۔

ان امور کے علاوہ ہم اس بابلی حکایت کو پڑھ کر اس زمانے کے مذہب، لوگوں کے مکانات اور ان کی صناعی وغیرہ کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ اس حکایت میں ہمیں بابلی دیوتا بھی عام انسانی کمزوریوں مثلاً دھوکہ، فریب، بزدلی، سازش، کم فہمی اور ناانصافی وغیرہ سے ملوث

طوفان کے بعد آت ناپشتم قربانی پیش کر رہا ہے۔
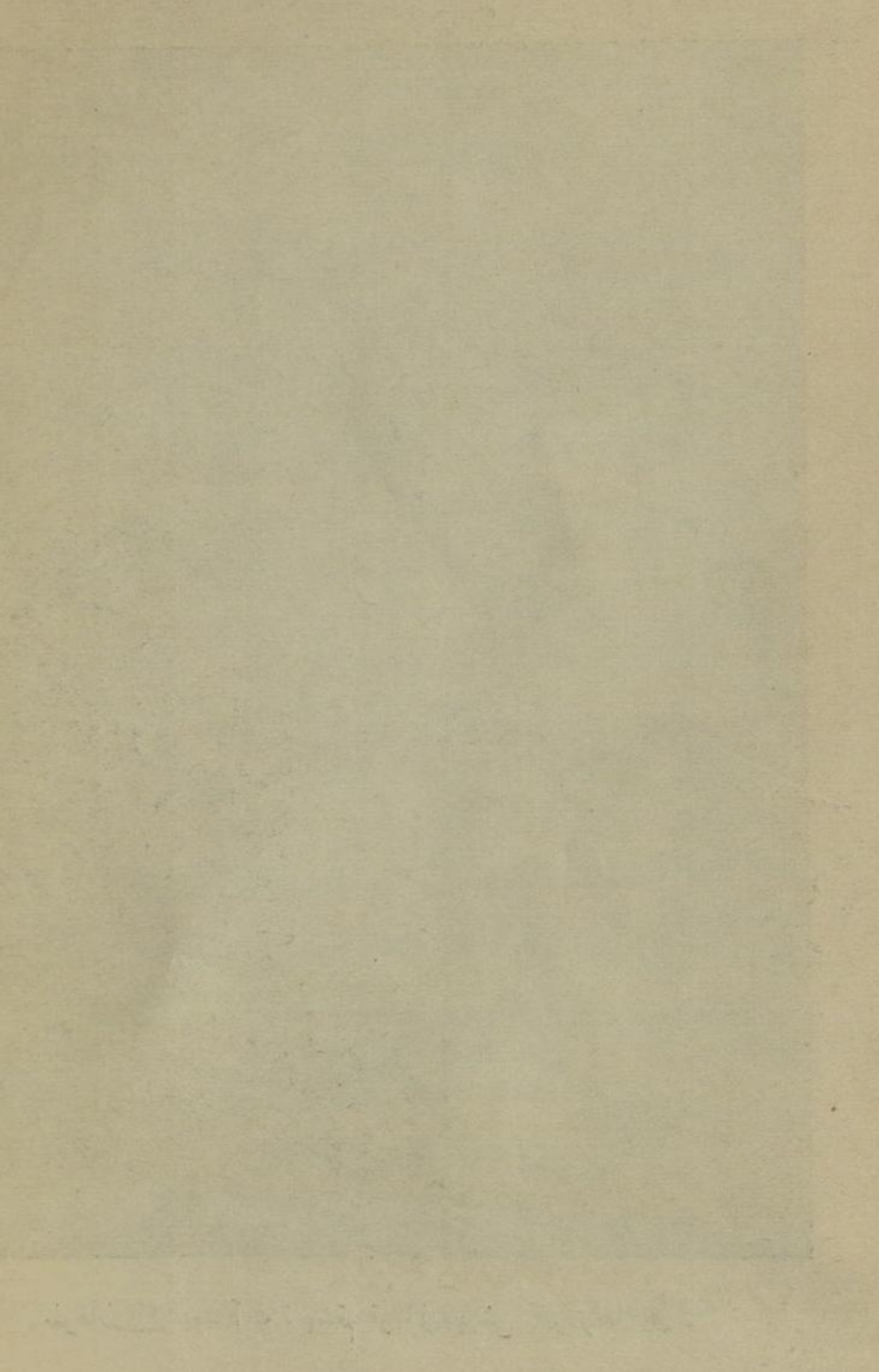
ملتے ہیں۔ نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں نے پہلے صرف شریپک کی تباہی کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب طوفان شروع ہوا تو ایک بہت بڑے علاقے کو محیط کر گیا۔

طوفانی حکایت دیگر اقوام میں

اس بابلی روایت کے علاوہ طوفان یا نسلِ انسانی کی بربادی سے متعلقہ کہانیاں مصر، ہندوستان، یونان، چین، برما، چینی کوچین، ملایا، آئرلینڈ، نیوزی لینڈ، نیوگی آنا، جزائر ملی نیشیا، پولی نیشیا، شمالی وجنوبی امریکہ، یورپ وافریقہ کے دیگر خطوں اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں میں پائی جاتی ہیں۔

مصری حکایت

زمین کے شہنشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتے کرتے جب سورج دیوتا را بوڑھا ہو گیا تو لوگوں نے اس کے خلاف بڑبڑانا شروع کر دیا۔ را نے سب دیوتاؤں کو بلا کر کہا "تمھارا مشورہ سنے بغیر میں اپنی (سرکش) رعایا کو سزا نہیں دینا چاہتا۔" اس کے باپ نوع نے، جو اوّلیں پانیوں کا دیوتا تھا، تمام نسلِ انسانی کی تباہی کا مشورہ دیا۔ را بولا "دیکھو لوگ پہاڑیوں میں جا چھپے ہیں کیوں کہ اب وہ اپنے انجام سے خائف ہیں۔" تب ہاتور دیوی آگے بڑھی اور انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ اب را بقیہ نوعِ انسانی کو بچا لینے پر آمادہ ہوا۔

اور اس کی خاطر اُس نے ہاتور کو ایک بہت بڑی پیش کش کی وہ یہ کہ اس نے رات کو جڑی بوٹیوں اور انسانی خون سے ملی ہوئی شراب برسائی۔ صبح جب ربّہ ہاتور آئی تو میدانوں کو غرقِ شراب پایا۔ بے پایاں مسرت و انبساط کے عالم میں اُس نے شراب پینا شروع کر دی اور پیتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ (نشہ میں دھت ہو جانے کی وجہ سے اسے پھر انسانوں کی شناخت نہ رہی۔

روایتِ ہنود ہندوؤں کے ہاں طوفان سے متعلق قصّہ متعدّد جگہ آیا ہے۔ (۱) شتت پتھ برہمنا (۲) مہابھارت (۳) متسیا پران (۴) بھاگوت پران اور (۵) اگنی پران وغیرہ میں۔ ابتدا میں علماء کا خیال تھا کہ مہابھارت میں یہ قصّہ توریت سے آیا ہے۔ مگر جب طوفان سے متعلقہ یہ روایت ویدک دور کے شتت پتھ برہمنا میں بھی ملی تو اُس کی قدامت ویدک زمانہ تک چلی گئی۔

مہابھارت میں طوفان کے ہیرو رشی منو کا ذکر یوں ملتا ہے کہ وہ اپنی بزرگی کے سبب برہما کے ہم سر ہو گیا تھا۔ وہ جنگل میں ایک ٹانگ پر کھڑا اور ایک بازو اٹھائے دس ہزار برس تک سخت تپسیا کرتا رہا۔

" ایک دن وہ گیلے کپڑوں میں کھڑا تھا کہ ندی سے ایک چھوٹی سی مچھلی نکلی اور منو سے اپنی حفاظت کی ملتجی ہوئی کیوں کہ ایک بڑی مچھلی اس کو نگل جانے کی فکر میں تھی اور ساتھ ہی اس ننھی مچھلی نے

اس حفاظت کا صلہ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ منو نے اسے پانی بھرے ایک مٹی کے برتن میں ڈال دیا۔ کچھ عرصہ بعد مچھلی اتنی بڑی ہو گئی کہ اسے تالاب میں چھوڑنا پڑا۔ وقت آیا کہ تالاب بھی اس کے لیئے تنگ ہو گیا۔ تو منو خود مچھلی کی ترغیب پر اسے گنگا میں چھوڑ آیا۔ بالآخر اُس کی جسامت اتنی بڑھ گئی کہ گنگا میں سما سکنا تو رہا ایک طرف، وہ اس میں حرکت تک نہ کر پاتی تھی لیکن اب اسے گنگا سے سمندر میں منتقل کرنا منو کے بس میں بھی نہ رہا تھا۔ تب وہ مسکراتی ہوئی بولی:

"خبردار ہو جا، اے عابد انسان! اے میرے محافظ، کہ کائنات اب منتشر ہونے کو ہے دنیا کو پاک کرنے کا معیّنہ اور نہ ٹلنے والا وقت اب قریب ہے۔ میری یہ نصیحت تیرے لیئے سُود مند ہو گی۔ ایک عظیم الجثہ کشتی بنا اور اس میں لمبا رسہ رکھ لے۔ تو اس میں سات رشیوں کے ساتھ سوار ہو گا اور اس میں سب مخلوق کا بیج حفاظت سے رکھ لینا۔ میرا انتظار کرنا۔ میں سینگوں والے جانور کی شکل میں پھر آؤں گی۔ میری ہدایت پر عمل کرنا کیوں کہ میری اعانت کے بغیر تُو اس طوفانِ عظیم سے بچ نہ سکے گا۔"

منو نے یہ سب تیاری کر کے متلاطم اور جوش کھاتے سمندر میں سفر کرنا شروع کر دیا۔ اُس نے مچھلی کو یاد کیا ہی تھا کہ وہ پانیوں سے ایک

جزیرہ کی طرح ابھری۔ منو نے (رسّہ کا) ایک پھندا بنا کر مچھلی کے سینگ میں ڈالا اور جکڑ لیا۔ اور پھر مچھلی نے جہاز کو غضب ناک سمندر کے سینے پر کھینچنا شروع کیا۔ موجوں کی تُندی کی وجہ سے جہاز ڈوبتے آدمی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا — ہر طرف پانی تھا زمین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پانیوں نے آسمانوں تک کو ڈھانپ لیا تھا۔

جب دُنیا اس طرح نذرِ سیلاب ہو رہی تھی تو منو، سات رشیوں اور مچھلی کے علاوہ کہیں بھی کچھ اور نہیں نظر پڑ رہا تھا۔ کئی سال بعد جہاز 'ہماوت' پہاڑ کی چوٹی سے جا لگا۔ تب مچھلی یوں گویا ہوئی۔

'میں برہما ہوں — سب کا خالق۔ کوئی مجھ سے افضل نہیں ہے۔ میں نے تجھے سیلاب سے بچایا ہے۔ منو پھر سے سب کو پیدا کرے گا۔ دیوتاؤں کو اور انسانوں کو بھی —"

میکنزی، میڈم زیڈ۔ اے۔ راگوزن اور سنسکرت کے نامور فرانسیسی عالم یوژین بوزلوف وغیرہ ہندوؤں کی اس روایت کا مآخذ بابلی حکایت کو قرار دے رہے ہیں۔ راگوزن کہتی ہے:

"آریوں کی آمد سے بہت پہلے سے ہی برّصغیر (پاک و ہند) کی ڈراویڑی قوم اور اہلِ کالدانیہ کے مابین گہرے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ منو کے نجات دہندہ دیوتا (برہما) اور اُتنا پشتم کے رستگار دیوتا ایا میں مماثلت کوئی اتفاقیہ نہیں ہے کیوں کہ

اوّل الذکر مچھلی کے روپ میں آیا اور موخر الذکر کی علامت بھی مچھلی ہے۔ جس کا ثبوت آثار سے ملتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض جزئی امور بھی مدِنظر رہنے چاہئیں مثلاً "اُت ناپشتم اور منو زہد اور تقوے میں ایک جیسے ہیں ۔۔۔۔"[1]

اگر واقعی یہ طوفانی حکایت ہندوؤں کے ہاں بابل سے آئی تو پھر اس کے آنے کی صورت یہ ہوگی کہ بابل سے یہ قدیم پاکستان میں پہنچی اور پاکستانیوں سے آریاؤں نے لے لیا۔

یونان برائز دَور کے دروغ گو اور مکّار یونانیوں کو بھی ایک طوفان کے ذریعے سے برباد کر دیا گیا تھا۔ یونانی روایت کی رو سے

"ایک مرتبہ ہرمیس کو ذیوس دیوتا نے کہا" میں ایسی بارش لاؤں گا کہ اس جیسی روزِ ازل سے لے کر آج تک نہیں ہوئی اور تمام نسلِ انسانی نیست و نابود ہو جائے گی"۔ تب ذیوس نے اپنے ایک پسندیدہ کہن سال شخص کو شاہ بلوط کی لکڑی سے ایک جہاز تیار کرنے اور اس میں وافر مقدار میں اشیائے خوردنی بار کر لینے کا مشورہ دیا۔ جب اُس مردِ ضعیف اور اس کی بیوی پیرہ نے جہاز میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ تو ذیوس نے گہرائیوں کے تمام چشمے ابال

---

[1] ویدک ہند، مترجم حمید احمد ۵۹-۲۵۸

دیے اور آسمانی کنوؤں کے منہ کھول ڈالے۔ چالیس رات اور چالیس دن مینہ پڑا ۔ سب کچھ تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ وہ بھی نہ بچ سکے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا پناہ گزین ہوئے تھے۔ کشتی "پرناسس" نامی پہاڑ پر آن لگی اور جب پانی اترا تو بیرانہ سال جوڑا نیچے اتر آیا اور ایک غار میں اپنا مسکن بنا لیا۔"

میکسیکو والوں کی روایت کی رو سے طوفان کا باعث سورج دیوتا تھا جس نے اچانک لُو پھیلادی اور یہ لُو زمین کے سوتوں سے بخارات کی شکل میں پھوٹ نکلی اور سب ذی حیات لقمۂ اجل بن کر رہ گئے۔

امریکی قبائل نہوا میں بابلی کہانی سے ملتی جلتی حکایت موجود ہے دیوتا طِطلاکان جوان نے نَتا نامی ایک شخص کو صنوبر کا درخت کھوکھلا کر کے ایک کشتی بنانے کو کہا تاکہ نَتا اپنی بیوی نینا سمیت آنے والے طوفان سے بچ سکے۔ نَتا اور نینا کو اپنے ساتھ مکئی کا صرف ایک بھٹہ لے جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہ جوڑا تباہی سے بچ نکلا تو کشتی میں مچھلی کی قربانی چڑھائی۔ بابلی دیوتا بعل کی طرح امریکی دیوتا بھی ان دونوں کو بچتا دیکھ کر مشتعل ہو گیا تھا۔

برازیل کے ربِ عظیم مونان نے دنیا اور اس کے عاصی بندوں کو خاکستر کرنے کے لیئے آگ کا طوفان بھیجا اور آگ کے شعلوں سے جو کچھ بچا تو ایک جادوگر نے اس قدر بارش برسائی کہ زمین غرقِ آب ہو کر

رہ گئی۔

شمالی مغربی (امریکی) 'انڈین' مدعی ہیں کہ وہ ایک ایسے خاندان سے ہیں جو طوفان سے بچ نکلا تھا۔ جرمنی کی روایت کا آغاز منو کے قصے سے بالکل مشابہ ہے۔

اس موقعہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان سب کہانیوں کا مرکز ایک ہی ہے؟ بعض علماء کے خیال میں یہ سب کہانیاں ایک ہی جگہ سے پھیلیں لیکن کی رائے میں محض سطحی اور خارجی مشابہت کی بناء پر یہ خیال صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ تمام کہانیاں مشترک الاصل نہیں ہیں۔ بلکہ ہوا یہ کہ بابلی واقعہ مذہبی مبلغین یا تجار اور مفتوحہ مفرور اقوام کے ذریعے سے بیشتر ایشیائی اور یورپی ممالک میں پھیل گیا۔ لیکن امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کی حکایتیں وہاں مقامی طور پر آزادانہ پھیلیں۔

کیا طوفان واقعی آیا؟

موجودہ خصوصاً پچھلی صدی عیسوی کے متعدد علماء مثلاً سی۔ پی ٹائل گنکل اور گرلینڈ وغیرہ اس بین الاقوامی شہرت کے حامل سیلاب یا طوفانِ نوحؑ کی آمد سے سرے سے ہی منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

"طوفان سے متعلقہ جتنی بھی روایات چلی آتی ہیں تاریخی طور پر ان میں کوئی اصلیت نہیں۔ اور یہ حکایتیں دراصل سورج اور دیگر اجرام فلکی کی نقل و حرکت سے متعلق ہیں۔ لوگوں کا ابتدا میں خیال تھا کہ سورج اور چاند 'آسمانی سمندر' میں بحری مسافروں کی طرح سفر کر رہے ہیں۔ یہی عقیدہ بابل اور بویلینشیا وغیرہ کی اوّلیں کہانیوں کی تخلیق کا سبب بنا۔ لیکن عرصہ دراز تک جب یہی حکایتیں بار بار دہرائی جاتی رہیں تو بجا طور پر یہ سمجھ لیا گیا کہ سمندر آسمان میں نہیں بلکہ زمین پر ہی ہے اور پھر شدید بارشوں اور بڑے دریاؤں میں طغیانیاں آتے رہنے کے سبب طوفان سے متعلقہ ایک نئی طویل (فرضی) کہانی نے جنم لیا لیکن کہانی ارضی تھی۔"

داستانِ جلجموس میں جو طوفان کی کہانی ہے۔ اس کے متعلق ان علماؑ کی توضیح یہ ہے:

"داستانِ جلجموس میں جتنی بھی مختلف حکایتیں ہیں (اور جن سے جلجموس بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح متعلق ہے) یہ سب سورج کی سالانہ گردش سے متاثر ہو کر ذہنِ انسانی نے تراش لی تھیں اور ان سب میں 'عملِ آفتاب' کا پرتو صاف جھلک رہا ہے۔ جب سورج گردش کرتا ہوا منطقۃ البروج کے ہر برج میں سے گزرتا ہے تو ساتھ ساتھ موسمیاتی کیفیت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اسی تبدیلیٔ موسم کی

مناسبت سے ہر برج کا نام رکھا گیا اور ہر برج کی ایک شکل فرض کرلی گئی اور طوفان کا یہ فرضی قصہ اس وقت سے متعلق ہے جب آفتاب گیارھویں برج یعنی 'دلو'[1] میں ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر عراق میں سخت بارشیں ہوتی تھیں جس کے باعث دجلہ و فرات اکثر طغیانیاں لاتے تھے اور اس طوفانی قصہ میں دراصل لوگوں نے اپنے وقت کی آسمانی کیفیت بیان کی ہے — یہ بابلی حکایت کسی اصنام پرست نے مختلف اور متضاد موسمیاتی روایتوں سے اخذ کرکے ترتیب دی تھی۔"

مذکورہ محققین نے اپنے خیال کی تائید میں منجملہ اور دلائل کے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ اُت ناپشتم کے باپ کا نام اوبر توت تھا جس کے معنی ہیں "ڈوبتے سورج کا جلال"۔ اسی نام سے انھوں نے یہ خیال بھی پیش کیا کہ قدیم لوگ شروع سے نوحؑ کو اہم درجہ دیتے ہیں اور انھیں 'سورج کا بیٹا' کہلاتے تھے۔

ہمیں تعجب ہے کہ آخر اس چیز کو باور کرنے میں کیا چیز مانع ہے کہ ازمنۂ قدیم

---

[1] برج 'دلو' کی شکل اس طرح مقرر کی گئی ہے کہ آدمی گھٹنوں کو جھکائے ہاتھ میں اوندھا کیے کثیر مقدار میں پانی گرا رہا ہے اور دوسرے ہاتھ میں پنے پکڑے ہے گویا شدتِ باراں کا اظہار مطلوب ہے۔ عربی میں 'دلو' کی اس صورت کو 'سالب الماء' کہتے ہیں۔

میں عراق کا کچھ حصہ کسی لرزہ خیز طوفان یا سیلاب کی لپیٹ میں آگیا جبکہ وہاں اکثر شدید بارشیں اور طغیانیاں آتی رہتی تھیں۔ اب اس سیلاب کو ہم "طوفانِ نوح" کہہ لیں یا "سیلابِ اُت ناپشتم" بات ایک ہی ہے اور مراد بھی ایک ہی طوفان سے ہے۔

طوفان کی اثری شہادت

"منکرینِ طوفان" کے استدلال کے خلاف اور الہامی کتب کی تائید

بس رہا سہا ثبوت قدرت نے انگریز ماہرِ اثریات لیونارڈ وولی کی ان کھدائیوں کے ذریعے سے پہنچا دیا جو انھوں نے عراق میں کیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ سر لیونارڈ وولی ۲۹-۱۹۲۸ء میں عراقِ قدیم کے شہر اور حضرت ابراہیمؑ کے وطن مالوف اُر میں ایک جگہ کھدائی کر رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر آبادی کے نشانات ختم ہو گئے اور صاف چکنی مٹی کی تہ نکل آئی۔ وولی اس چیز کو مان نہ سکے کہ مسلسل مدنیت کے آثار یوں یکلخت ختم ہو سکتے ہیں۔ اُنھوں نے کھدائی برابر جاری رکھی۔ چنانچہ آٹھ فٹ سے کچھ ہی زیادہ موٹی تہ کے بعد حسب توقع کھنڈرات پھر شروع ہو گئے۔ اس جگہ سے شمال مغرب میں تین سو گز پرے ہٹ کر کھودا گیا تو وہاں بھی چکنی مٹی کی ایسی ہی تہ پائی گئی۔

آخر اس غیر معمولی تہ کا کیا راز تھا؟ — اور یہ مٹی جو عراق کی دو تہذیبوں کے درمیان گویا حدِ فاصل کا کام دے رہی تھی۔ کہاں سے آئی؟ — چنانچہ

وولی کو بجا طور پر خیال گزرا کہ اس نے طوفانِ نوحؑ کی اثری شہادت پالی ہے اور اتنی موٹی تہ کسی بڑے ہی خوفناک طوفان کی جمائی ہوئی تھی، ایسا ہولناک طوفان جس کی مثال مقامی تاریخ میں کوئی نہ ہوگی اور جسے لوگ عرصہ دراز تک بھول نہ سکے۔ حتیٰ کہ اس کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور پھر بابلیوں نے رفتہ رفتہ اس پر خوب ہی حاشیہ آرائی کی۔ سومیری کہانیوں میں اسی طوفان کا ذکر ہے، اسی طوفان کی جانب قرآن کریم اور دیگر مذہبی کتب میں اشارے ہیں۔

جہاں تک بابلی حکایت کا تعلق ہے ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایک حقیقی واقعہ کی مبالغہ آمیز شکل ہے اور بس۔ اس کے باوجود یہ طوفان بابلیوں کے نزدیک اس قدر اہم تھا کہ وہ اسے عراق کے شاہی خاندانوں کے سلسلے کے درمیان حدِ فاصل قرار دیتے تھے ایک جگہ لکھا ہے،

"تب طوفان آگیا اور طوفان کے بعد آسمان سے ملوکیت دوبارہ نازل ہوئی۔"

گویا ان کے ہاں واقعہ طوفان، کو وہی اہمیت حاصل تھی جو آج سنہ عیسوی کو حاصل ہے۔ متعدد بابلی تختیوں پر قبل از طوفان اور بعد از طوفان کے بادشاہوں کے نام علیحدہ علیحدہ لکھے ہیں۔

کیا طوفان عالم گیر تھا؟ عام طور پر مشہور ہے کہ ساری دنیا طوفان

کی لپیٹ میں آگئی تھی لیکن واقعتاً ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے۔ بابل کی قدیم روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں نے طوفان ایک مخصوص شہر یا علاقے کی تباہی کے لیے بھیجا تھا۔ قرآن کی رو سے بھی طوفان عالم گیر نہ تھا البتہ بائبل کا انداز اس قسم کا ہے گویا یہ سیلاب ساری دُنیا کو محیط کر گیا تھا۔

بعض ماہرین طبعیات کی رائے ہے اب سے کوئی ساڑھے چھ ہزار برس قبل کوہ ایلبرس میں کچھ طبیعی تبدیلیاں ظہور میں آئیں جن کے سبب بحیرہ روم میں پانی کی سطح بھی تغیر پذیر رہی اور اس کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیا کے پہاڑوں پر شدید برف باری بھی ہوئی اور پانی بھی برسا انہی تبدیلیوں کے باعث طوفان آگیا[1] چنانچہ کچھ محققین کی رائے میں طوفان کی زد میں مصر، عراق اور ایران وغیرہ آگئے اور اس کا ثبوت وہ یہ دے رہے ہیں کہ بداری (زیریں مصر) ابوشہرائن، العبید اور یپّہ موسیاں (عراق) اور سوسہ (ایران) وغیرہ کی سب سے نچلی تہ سے برآمد شدہ سفالی ٹکڑے اور رنگین و منقوش ظروف باہمی مشابہت کے سبب ایک ہی دور کے ہیں اور

---

[1] سوئس (   ) کے خیال میں طوفان کا سبب یہ تھا کہ ہولناک طوفان کی وجہ سے خلیج فارس کا پانی چھلک گیا تھا۔ گو اس نظریہ کو کئی علماء کی حمایت حاصل ہے لیکن بابلی کہانی میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے۔

اس سب سے نچلی سطح پر مٹی کی خالی تہ موجود ہے جس کے اوپر بعد کے زمانوں کے آثار مل رہے ہیں گویا ان تمام مقامات پر بیک وقت تباہی آئی تھی۔

لیکن ایسا نہیں ہے یہ طوفان صرف دجلہ و فرات کی وادی کے زیریں حصّہ میں آیا — اور چار سو میل لمبے اور سو میل چوڑے رقبے کو متاثر کر گیا تھا — ابنِ خلدون کے خیال میں پانی عقبۂ حلوان تک پہنچا تھا۔

طوفان کا شکار کونسی قوم تھی؟

وولی نے طوفان کی جمائی ہوئی مٹی کی جو تہ نکالی ہے اس کے اوپر خالصتاً سومیری قوم کا تمدن تھا — لیکن نیچے سومیریوں اور اس قوم کے مخلوط آثار تھے جو وادیٔ دجلہ و فرات میں سومیریوں سے پہلے آباد تھی — گویا یہ طوفان سومیریوں اور ان کی پیش رو قوم کے سر سے گزرا تھا۔ سومیری تو عموماً پختہ شہروں میں آباد تھے اور ان کے یہ شہر اونچی جگہوں پر بنے ہوئے تھے اور غیر سومیری نشیب میں واقع کچے گاؤں میں رہتے تھے۔ طوفان سے زیادہ متاثر بھی یہی دیہاتی ہوئے اور ان کے گاؤں زمین کے برابر ہو گئے — سومیری روایتوں کی رُو سے ان کے کچھ شہر بچ رہے تھے اور یہ یقیناً وہ تھے جو پختہ تھے اور بہت بلندی پر آباد تھے۔

حضرت ابراہیمؑ اور اسلافِ یہودؔ

حضرت ابراہیمؑ اور اسلافِ یہود

تہذیبی قدامت کے لحاظ سے عراق، مصر اور پاکستان کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ان تینوں ملکوں میں تاحال عراق تمدن انسانی کا اولین سرچشمہ قرار دیا جا رہا ہے اور یہ عراق نہ صرف "تہذیب خیز" ہے بلکہ پیغامبر خیز بھی حضرت نوحؑ نے اسی سرزمین کے شہر 'شریک' میں پیغامِ حق دیا۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود میں صداقت کے لیے یہیں آویزش ہوئی۔ حضرت اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کی آبائی سرزمین یہی تھی۔

یہودیوں کے آباؤ اجداد کا مدتوں یہی مسکن رہا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر سے پہلے ہمیں اسرائیلیوں کے انہی بزرگوں کے متعلق کچھ جان لینا چاہیئے۔

اسرائیلیوں کے بزرگ

محققین اس امر پر قریباً متفق ہیں کہ اہلِ یہود یا عبرانیوں کے اسلاف کا اولین گہوارہ عرب تھا۔ منہدک وان لون کے الفاظ میں:

"نیل اور دجلہ و فرات کی وادیوں کے آباد کار جس زمانے میں متمدن زندگی کی گہما گہمی میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس وقت صحرا نوردوں کا

ایک چھوٹا سا قبیلہ عرب کے ریگ زاروں سے اٹھا اور زیادہ شاداب زمینوں کی تلاش میں شمال کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ آنے والے زمانوں میں انہی لوگوں کو یہود کے نام سے متعارف ہونا تھا اور یہی عربی قبیلہ تھا جو ہمیں اہم ترین کتاب (بائبل) دینے والا تھا[1]۔"

ڈیپچ کہتا ہے:

"عبرانی دراصل عرب کے رہنے والے تھے۔"

بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن ہمارے خیال میں عبرانی خالصتہً عرب نہیں رہ گئے تھے بلکہ ان کی رگوں میں شمالی اقوام کے خون کی آمیزش ہو چکی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ زمانہ قدیم میں عربی صحرا نشین اکثر خوراک اور حاصل خیز زمینوں کی تلاش میں شمال میں فلسطین، شام، عراق تک پہنچتے رہے ہیں۔ لیکن شام سے بھی دیگر قبائل نیچے کو اترتے رہے اور رفتہ رفتہ یہ لوگ باہم مربوط ہوئے تو مخلوط نسلیں وجود میں آگئیں۔ لہذا اس امر کا بھی بہت امکان ہے کہ انہی مخلوط قبائل میں سے یہودیوں کے آباؤ اجداد بھی تھے۔

ان کی اجمالی تاریخ

بہرحال عام نظریئے کے مطابق یہود کے اوّلیں بزرگ صحرائے عرب کی وسعتوں ہی میں گم تھے۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کونسی صدی قبل مسیح یہ لوگ مغربی ایشیا کے

---

[1]

[2]

کسی حاصل خیز خطے کی فکر میں عرب سے نکلے، البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ عرب سے نکل کر وہ صدیوں تک کسی ایسے قطعۂ زمین کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے جسے وہ اپنا وطن تو کہہ سکتے لیکن اب وہ گم کردہ راہ ہو چکے تھے، انہی یہودیوں یا عبرانیوں نے گاہے گاہے صحرائے سینائی کو عبور کیا اور برائے چندے مصر میں جا رہے۔ اس زمانے کے جن حالات کا تذکرہ عہد نامۂ قدیم میں ہے، ان پر کچھ روشنی، مصری اور اشوری تحریریں بھی ڈال رہی ہیں۔ آگے کی تاریخ بہت واضح ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے مصر سے حضرت موسٰیؑ کی سرکردگی میں ہجرت کر کے شاہراہوں کی سرزمین شام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے فلسطین پر قبضہ کر کے ایک قوم کی شکل اختیار کر لی اور کن حالات میں صدیوں تک یہ عجیب اور نبرد آزما قوم اپنی آزادی برقرار رکھنے کو دوسروں سے برسرِ پیکار رہی۔ بنوکدنصر (بخت نصر) کے مظالم سہے، رومیوں کی غلام بنی اور پھر کس طرح تاریخی دور سے لے کر ۱۹۴۸ء تک وہ مختلف اقوام کے درمیان مفروروں کی زندگی بسر کرتی رہی۔

معاشرت

بدقسمتی سے ان کی ابتدائی تاریخ کے متعلق ہمیں بس کچھ یوں ہی سی معلومات ہیں اور بادیہ پیماؤں کے متعلق تفاصیل جانی بھی نہیں جا سکتی ہیں۔ بہر کیف کلدانیہ کے قدیم دور میں آوارہ خرام گلہ بانوں کی جمعیتیں فرات اور شام کے درمیان پھرتی رہتی تھیں۔ اُر سے نکلنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کے قبیلے کی بھی یہی کچھ کیفیت تھی۔ عرب کے

یہ (مخلوط) سامی النسل مہاجر مشابہ زبان بولتے اور موقعہ محل کے لحاظ سے سے کبھی تو مصر کے فرعونوں اور کبھی بابل کے بادشاہوں اور سلاطین اشوریہ کی بالادستی تسلیم کرتے تھے۔ دائمی طور پر باہم دست و گریباں رہنا ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ البتہ جب کبھی فراعنہ یا شاہانِ 'اکاد' کے کارندے ٹیکس وغیرہ کی وصولی کے لیے آن پہنچتے تو یہ ذرا سکون سے بیٹھ جاتے۔ اور ان کے جانے کے بعد پھر وہی انتشار اور کشت و خون کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ غرض یہودیوں کے آبا و اجداد نے اپنے کردار کا آغاز سرزمین عراق و شام میں رہ کر جہاں گردی، چوری چکاری اور باہمی عناد و فساد سے کیا۔

یہ لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قبیلہ والے اپنے بزرگ شیخ کے پوری طرح فرمانبردار ہوتے اور بہ نگاہ عزت دیکھتے تھے۔ ان شیخین کے حرموں میں بہت سی عورتیں اور خدام ہوتے تھے لیکن جتنے حقوقِ آزادی اور سماجی برتری عورتوں کو اس وقت حاصل تھی۔ اتنی نہ تو بعد کے یہودیوں نے اپنی عورتوں کو دی اور نہ آج کل حاصل ہے۔ عورتیں خیموں اور گلوں کی نگران اور مالک و مختار تھیں۔ مستورات اور بچے تو خیموں میں رہتے اور سوتے تھے اور بے چارا مرد عموماً راتوں کو بھی کھلے آسمان تلے، یا کسی چٹان اور جھاڑی کی اوٹ میں بسیرا کر لیتا۔ عورت دن بھر جانور چراتی یا جائداد، سامان اور خاندان کی مالک و مختار بنی رہتی اور مرد دن بھر اونٹ لیے تجارت کی خاطر

دُور دراز مارا مارا پھرتا، جنگ و جدل میں مصروف رہتا۔ جو کچھ کما کر لاتا وہ عورت کی نذر کر دیتا اور اس کی یہ پونجی سونے چاندی کے پازیب، نتھ، بازو بند، گلوبند اور ہاروں کی شکل میں عورت کے جسم کی زینت بن جاتی۔ تمام جائداد اور ورثہ کی مالک بھی عورت ہوتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں اخلاقی اور سماجی قوانین آج سے بہت کچھ مختلف تھے۔ سوتیلے بہن بھائی کی شادی جائز تھی[1]۔ عام طور پر اونچے گھرانے کی عورتیں اپنے خاوندوں سے بس یونہی سا تعلق رکھتی تھیں اور اگر انھیں زیادہ مہذب اور پُر آسائش مادی زندگی کی جھلک دکھائی جاتی تو وہ اپنے شوہروں کو دھتا بتانے پر تیار رہتی تھیں۔

مکفیلہ غار اور متعلقہ اراضی کی خرید و فروخت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زمین پر لوگوں کو مالکانہ حقوق حاصل تھے اور نظام جاگیرداری موجود تھا، لوگ اپنی اراضی فروخت کرنے اور ہبہ کرنے میں پوری طرح آزاد تھے۔ بائبل میں حضرت ابراہیمؑ یا ان کے متعلقین کے پاس کسی مخصوص قسم کی جائداد ہونے کا تذکرہ نہیں ہے سوائے اس مکفیلہ والے غار اور کھیت کے جو آپؑ نے عفرون حتی سے مول لیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپؑ کے پاس غیر منقولہ جائداد تھی ہی نہیں، جو شخص قبرول

---

[1] بائبل

کے لیئے جگہ خرید سکتا ہے وہ رہائشی مکان اور اراضی خرید لینے پر بھی یقیناً قادر ہو گا، بہر کیف عام طور پر ان لوگوں کے پاس نہ چوبی فرنیچر تھا اور نہ کوئی عمارت، نہ تکلفاتِ زمانہ اور نہ آرائش، بہ امرِ مجبوری ان کی خوراک بہت سادہ، عموماً سبزی اور گوشت پر مشتمل تھی۔ چند اونی کپڑے، لکڑی کے دو چار برتن، اونٹ کے بالوں کے کمبل، کچھ صندوق اور مویشی — یہ تھی ان کی کُل کائنات۔ بعض لوگوں کے پاس سونا چاندی بھی تھا لیکن ان کی سب سے بڑی دولت جانوروں کے گلّے تھے۔

عبرانی کی تشریح ان ہی قبیلوں میں سے بعض ایک حد تک مدنی زندگی بھی اختیار کر چکے تھے جن میں سے ایک حضرت ابراہیمؑ کا قبیلہ تھا اور 'اُر' میں آباد تھا۔

آپؑ کا بھی قبیلہ 'حبرو' یا 'عبرانی' کہلایا۔ 'عبرانی' یا 'حبرو' کے معنے ہیں "(دریائے فرات کے) اُس پار سے آنے والے لوگ"۔ یہ آرامی لفظ 'عبھرے' یا 'حبرے' سے نکلا ہے جو عہد نامہ قدیم کے لفظ 'عبری' کے مرادف ہے۔ عبری (عبھری) کے حقیقی معنی عبر (عبھر) میں مضمر ہیں

---

[1] 'اُر' کا شہر جو اب 'مقیر' کہلاتا ہے۔ بابلی سرزمین میں عرب کی سرحد کے قریب ہی تھا اب یہ مقام بابل اور خلیج فارس کے قریباً درمیان واقع ہے لیکن اس زمانے میں 'ار' سے خلیج فارس کا ساحل آج کی نسبت بہت نزدیک تھا۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے یہ 'ار' قدرتی طور پر سامیوں کا مرکز تھا۔

اور 'عَبَر' کا مطلب ہے "(اس پار سے) اُس پار جانا یا دوسری طرف جانا" — 'عَبَر' کا اسم ہے 'عِبر' اور 'عِبر' کا مفہوم ہے "(دریا کا) دوسرا کنارہ" یہودی روایات میں 'عِبری' کا مطلب یہ لیا گیا ہے 'اُس پار سے آنے والا آدمی' بہ الفاظِ دیگر 'فرات یا اُردن کے اُس پار آنے والا آدمی' — اسی لیئے بائبل میں ایک جگہ 'ابرام عبرانی' آیا ہے (پیدائش ۱۴:۱۳) یعنی 'عبور کرنے والا، پار اُترنے والا'۔ مختصر کہ اس زمانے میں لفظ 'عبری' دریائے فرات کے اس پار آنے والا آدمی' کے معنی دے رہا تھا۔ علمارِ جدید کا خیال ہے کہ کنعانیوں نے حضرت ابراہیمؑ کو عبرو یا عبرانی کہہ کر پکارا، اور یہ نام آپؑ کو اس لیئے دیا گیا کہ وہ فرات کے 'اُس پار' سے آئے اور کنعان میں بس گئے۔

بعض لوگوں کے خیال میں اس قوم کا 'عبرو' یا عبرانی نام دراصل سام بن نوحؑ کے پڑپوتے عَبر کے نام پہ ہے۔ ابراہیمؑ اسی عَبر کی نسل سے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں بیان ہوا ہے — ابراہیمؑ بن تارح بن نخور بن سروج بن رعو بن فلیج بن عبر بن سلیح بن ارفکسد بن سام بن نوحؑ — بہرحال عبرو یا عبرانی کے معنی حضرت یعقوبؑ سے قبل جو بھی رہے ہوں، یعقوبؑ کے بعد یہ نام ان کی اولاد اور ان سے متعلقہ قبائل کے لیئے وقف کر دیا گیا اور 'اسرائیلی' کے مترادف ہو گیا۔ 'اسرائیل' دراصل وہ نام ہے جو (بقول بائبل) حضرت یعقوبؑ کو خدا سے کشتی لڑنے

کے بعد دیا گیا (پیدائش ۳۲/۲۸) ۔ مؤخر الذکر اصطلاح یعنی اسرائیلی تو یہ لوگ باہم دگر بولتے تھے لیکن اوّل الذکر نام یعنی ”عبرانی“ اقوامِ غیر میں معروف تھا۔

آپؑ کا زمانہ

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کونسا مشہور تاریخی عہد پایا ہے۔ ماہرین اس سلسلے میں مختلف نظریئے پیش کر رہے ہیں۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ آپؑ اُرؔ کے تیسرے شاہی خاندان کے کسی فرمانروا کے زمانے میں ہو گزرے ہیں اور دلیل اس کی یہ دیتے ہیں کہ اس تیسرے خاندان کے سلاطین ہی اپنی پرستش کرایا کرتے تھے۔

حُسنِ اتفاق سے ایک دو کتبے ایسے مل گئے ہیں جن سے ذہن ابراہیمؑ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک کتبے پر ابی۔ رامو نام لکھا ملتا ہے۔ یہ کتبہ دو ہزار قبل مسیح کا ہے لیکن تا حال اس سے حتمی طور پر یہ ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ ابی۔ رامو سے مراد حضرت ابراہیمؑ ہی ہیں۔ اس موقعہ پر ایک بات اور واضح کر دی جائے کہ بابل کے پہلے شاہی خاندان کے زمانے میں متعدد لوگوں کے نام ابراھم، ابام راما اور ابارا ہام ملتے ہیں یہی نہیں بلکہ سارغن اوّل (۲۷۵۲/۲۶۹۲ ق۔م) کے ایک بیٹے کا نام ای۔ بارہم تھا جو حضرت ابراہیمؑ سے بے حد مشابہ ہے ــــ دوسرا کتبہ قدیم عراق کے مشہور شہر لارسہ کے حکمران نُرعداد یا مُرعداد کا ہے۔

اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ بابل کے پہلے عربی نسل شاہی خاندان کے نامور مقنن چھٹے حکمران حمورابی کے ہم عصر ہوئے ہیں۔ حمورابی نے ۲۰۶۷ ق۔م سے ۲۰۲۵ ق۔م تک حکومت کی ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اس خاندان کے تمام بادشاہوں کی فہرست دے دی جائے، اس لئے کہ نہ صرف حضرت ابراہیمؑ نے اپنی طویل عمری کے سبب بابل کے اس پہلے خاندان کے کئی بادشاہوں کا دور دیکھا بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ بھی ان سلاطین کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔

۱۔ سمواُبوم	——	۲۱۶۹ ق م تا ۲۱۵۶
۲۔ سمواِیلم	——	۲۱۵۵ ق م تا ۲۱۲۰
۳۔ رابلیوم	——	۲۱۱۹ ق م تا ۲۱۰۹
۴۔ اِبیل سن	——	۲۱۰۵ " " ۲۰۸۸
۵۔ سن مبلت	——	۲۰۸۷ " " ۲۰۶۸
۶۔ حمورابی	——	۲۰۶۷ " " ۲۰۲۵
۷۔ شمش ایلنا	——	۲۰۲۴ " " ۱۹۸۷
۸۔ ابی ایشو	——	۱۹۸۶ " " ۱۹۵۹
۹۔ امی دِیتنا	——	۱۹۵۸ " " ۱۹۲۳
۱۰۔ امی صدوق	——	۱۹۲۱ " " ۱۹۰۱
۱۱۔ شمش دِتینا	——	۱۹۰۰ " " ۱۸۷۰

آپ کا سالِ ولادت اگر ہم چارلس مارسٹن اور جناب مالک رام وغیرہ کے خیال کے مطابق ۲۱۶۰ قبل مسیح اور سالِ وفات ۱۹۸۵ قبل مسیح مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپؑ اس خاندان کے پہلے سات فرمانرواؤں کا عہد دیکھ چکے تھے۔[1]

بائبل کی شہادت

بائبل سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ حمورابی کے ہم عصر تھے اسی بادشاہ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ عہد نامہ قدیم میں بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے اور جس واقعہ میں اس حکمران کا تذکرہ ہے وہ بائبل کا سب سے پہلا سیاسی واقعہ ہے اس واقعہ میں بابل کے لئے 'سنعار' آیا ہے اور حمورابی کو امرافیل لکھا گیا ہے:

> "اور سنعار کے بادشاہ امرافیل اور الاسر کے بادشاہ اریوک اور عیلام کے بادشاہ کدرلاعمر اور جوئیم کے بادشاہ تدعال کے ایام میں یوں ہوا کہ انھوں نے سدوم کے بادشاہ برع اور عمورہ کے بادشاہ برشع اور ادمہ کے بادشاہ سنی آب اور ضبوئیم کے بادشاہ شمیبر اور بالع یعنی ضُغر کے بادشاہ سے جنگ کی۔" (پیدائش ۱۴: ۱،۲)

---

[1] ہیرؔ کی آپؑ کی پیدائش ۲۰۴۰ ق۔م بتلاتا ہے۔

حمورابی کا نام بعض قدیم تحریروں میں امورابی اور رامورپی بھی پایا گیا ہے۔ 'حمو' یا 'آمو' دراصل ایک دیوتا کا نام ہے۔ اس طرح حمورابی کے معنی ہوئے "حمو یا امو میرا خدا ہے" قدیم بابلیوں کے ہاں ایک اور رواج ملتا ہے کہ وہ اپنے عظیم فرمانرواؤں سے الوہی صفات منسوب کرنے کو، اس کے اصل نام کے آخر میں 'ایل' یا 'ایلو' کا لاحقہ بڑھا دیتے تھے۔ ایل بمعنی خدا۔ (اللہ اسی لفظ 'ایل' سے نکلا ہے) بدیں وجہ حمورابی کو بعض کتبوں میں امور-پی-ایل لکھا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس امور-پی-ایل اور بائبل کے امرافل میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سامی زبانوں میں 'ح' کی جگہ 'ا' اور 'ب پ' کی جگہ 'ف' عام طور پر مستعمل رہے ہیں۔ اس تمام تصریح سے ظاہر ہو گیا کہ امرافل اور حمورابی دراصل ایک ہی شخصیت ہے اور حضرت ابراہیمؑ اسی کے ہم عصر تھے۔

نمرود کی اثری شہادت

آپ کی زندگی کے واقعات تاریخی لحاظ سے سلسلہ وار بیان کرنا تو قطعاً غیر ممکن ہے کیوں کہ آپ سے متعلقہ مختلف روایات کو خلط ملط کر دیا گیا ہے اور ان میں سے بعض روایات تو مختلف ادوار کی پیداوار ہیں پھر ان روایتوں کے مؤلفین نے واقعات کے ربط اور تسلسل کا مطلق خیال نہیں رکھا۔

آپ کی زندگی کا سب سے پہلا اور نمایاں واقعہ ہے نمرود سے کش مکش۔ سب سے پہلے

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ نمرود کون تھا۔ مذہبی تصریحات کے علاوہ کیا اثریاتی طور پر بھی 'واقعہ نمرود' کی کوئی شہادت ملتی ہے؟ — سومیر میں شاہی خاندانوں کے متعدد سلسلے گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک خاندان کا مرکزی شہر 'لارسہ' تھا۔ اسی خاندان کا ایک بادشاہ نرعداد یا مرعداد تھا۔ اس نے سومیر کے سابق مرکزی اور حضرت ابراہیمؑ کے وطن مالوف "ار" میں ایک عمارت تعمیر کرا کے اس پر یہ عبارت کندہ کرائی:

"یہ عمارت نرعداد نے اس وقت بنوائی جب اس نے ناعید شمش باغی کو نکالا اور 'ار' کو فتنے سے بچایا۔"

ناعید شمش سامی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں 'منکر آفتاب' — بعض علماء اس کتبہ کو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کرتے ہیں۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ نرعداد کا یہ کتبہ حضرت ابراہیمؑ سے ہی متعلق ہے اور سورج کی پرستش سے یہی انکار اور بغاوت 'ار' سے آپؑ کی ہجرت کا سبب بنا تو اس سے کئی باتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں

اولاً تو یہ کہ آپ نے ۲۱۴۱ ق۔م سے ۲۱۲۵ ق۔م کے بین بین 'ار' سے ہجرت کی۔

ثانیاً یہ کہ آپؑ کی سیاسی قوت اور اثر و نفوذ بالکل ہی معمولی نہ تھا کتبے کی عبارت صاف بتلا رہی ہے کہ ناعید شمش کی یہ باغیانہ روش اس قدر اہم اور خطرناک تھی کہ نرعداد کو اس کی یاد میں ایک عمارت بنوا کر یہ واقعہ لطیر

یادگار کندہ کرا دینے کی ضرورت پیش آئی۔

ثالثاً یہ کہ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ نرعداوبی امتدادِ زمانہ کے باعث بگڑتے بگڑتے روایتی نمرود بن گیا ہو۔

اس کتبہ سے ایک بات اور حتمی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے سامی اسلاف خواہ جہاں گردی میں مصروف رہے ہوں لیکن آپؑ ہجرت سے پہلے مدنی زندگی بسر کر رہے تھے۔

بائبل میں آپ کی عمر ۱۷۵ برس آئی ہے لیکن آپ اگر سو سال کے بھی ہوئے ہوں تب بھی آپ نے نرعداد والی لارسہ اور حمورابی کا دور بآسانی دیکھا گویا آپ نرعداد کے زمانے میں ۱۹۔ اور ۳۵ برس کے بین بین تھے اور اگر آپؑ نے اُر سے ہجرت ۱۹۴۱ ق۔م میں بھی کی ہو تو آپؑ اس وقت کم از کم اُنیس، بیس سال کے ہوں گے۔

اُر سے ہجرت

کوئی چار ہزار برس ہوتے ہیں کہ آپؑ نے مخلوط سامی قبیلے کو لے کر بیشتر مذہبی اور کچھ اقتصادی وجوہات کی بنا پر اپنے وطن اُر سے ہجرت کی اس قبیلے نے

ا؎ ابراہیمؑ اور آتشِ نمرود کے سلسلے میں بھی مغربی علماء نے حسبِ معمول خوب خوب تنقیدیں کی ہیں ڈاکٹر ڈِل کے الفاظ میں "یہ روایت (آتشِ نمرود والی) محض ایک غلطی سے پیدا ہوئی۔ یعنی کتاب پیدائش باب ۱۵ کی آیت ۷ سے: (بقیہ برصفحہ ۱۰۶)

'اُر' سے نکل کر بابلی فرمانروا کی قلمرو میں نئی چراگاہیں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن شاہی فوجوں نے اسے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا۔ اب ان بے وطنوں نے جنوب کا رُخ کیا تاکہ کسی ایسے چھوٹے سے خطۂ زمین پر جا آباد ہوں جہاں کوئی اور بڑی طاقت نہ بستی ہو۔ غرض یہ قافلہ بابل کی عظیم وادیوں سے بچتا اور صحرائے عرب کے کنارے کنارے ہوتا ہوا مغربی ایشیا کی شاداب چراگاہوں میں آپہنچا۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے والد تارخ اس قافلہ کی راہنمائی کر رہے تھے۔ حضرت لوطؑ بطور نائب ہمراہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵) "میں خداوند ہوں جو تجھے کلدانیوں کے ار سے نکال لایا" جوناتھن نے 'اُر' کو 'اور' سے سمجھ لیا جس کے معنی عبرانی میں نور یا روشنی کے ہیں لہٰذا اس نے منقولہ آیت کا ترجمہ کیا۔ "میں وہ خدا ہوں جس نے تجھے کلدانیوں کی آگ کی بھٹی سے باہر نکالا"۔ اس طرح یہ تمام قصہ محض ایک لفظ کے غلط معنی کرنے سے پیدا ہو گیا ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہ تھی۔" بحوالہ نگار "خدا نمبر"

۱؎ اسلامی روایت میں آپ کے والد کا نام آذر آتا ہے۔ لفظ آذر پر بحث کرتے ہوئے مولانا آزاد کہتے ہیں۔ "ابراہیمؑ کے والد تارح کا بچپنے میں انتقال ہو گیا تھا۔ چچا نے پرورش کی تھی اور چونکہ وہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا اس لیئے آوار کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آوار قدیم کالدی زبان میں بڑے پجاری یا محافظ معبد کو کہا کرتے تھے جس نے بعد کی عربی میں آذر کی شکل اختیار کر لی اور اسی لیئے قرآن نے اس کا ذکر آذر کے نام سے کیا۔" ترجمان القرآن دوم صفحہ ۴۹

اس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اعلیٰ درجے کی تمدنی زندگی اور اپنی معقول زمینداری ترک کی اور خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر کے موجودہ سرزمین کنعان کی جانب اپنے قبیلے کو لے چلے اور اس طرح عبرانیوں کی سب سے پہلی بڑی ہجرت کا آغاز ہوا۔

آپ کی اس ہجرت کی مختلف وجوہات بتلائی جا رہی ہیں۔ فرانسیسی محقق ڈی۔ بورگن عیلامیوں کی ترکتازیوں کو ابراہیم کی نقل مکانی کا ذمہ دار قرار دے رہا ہے۔ معاشی حالات اور نئی چراگاہوں کی تلاش بھی اس کا ایک سبب بیان کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور اثریات کی رُو سے یہ ہجرت خدا کی مرضی کے تابع اور نمرود سے مذہبی اختلافات اور اس کے پیش آمدہ نتائج کی بنا پر ہوئی۔

اُر سے آپ حاران آئے اور حاران سے چل کر دمشق ہوتے ہوئے کنعان کی پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ آپؑ کے ورودِ فلسطین کے متعلق بھی مورخین میں بہت اختلاف ہے۔

لیپسس کے خیال میں آپ ۱۷۳۰/۱۷۰۰ ق۔م کے بین بین واردِ فلسطین ہوئے۔ بنسن ۲۸۸۶ھ ق۔م بتلاتا ہے شٹکل نے ۲۱۳۰/۲۱۴۰ ق م کا زمانہ متعین کیا ہے۔ پیٹری کی رائے میں آپ ۲۱۱۰ ق۔م میں کنعان آئے۔

مصر میں

کنعان قحط کی زد میں آیا تو آپؑ کو مصر کا رُخ کرنا پڑا۔ تارح اور حضرت ابراہیمؑ کے عبرانی قبائل کی اُر سے

حاران، حاران سے حبرون اور وہاں سے مصر کو روانگی اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ وہ زمانہ ہی بڑا ناسازگار اور پُر آشوب تھا۔ مصر پہنچنے سے پہلے آپ نے کنعان میں دو مقامات پر قربان گاہیں بنائیں۔ ان میں سے ایک نو سکم کے مقام پر تھی اور دوسری بیت ایل اور عی کے درمیان کسی جگہ پر حضرت ابراہیمؑ اپنے متعلقین کے ہمراہ مصری شہر اون (ہیلو پولس) میں آباد ہو گئے یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے قبیلے والے پہلے سامی نہیں تھے جو مصر میں آئے ہوں بلکہ ان کی آمد سے بہت پہلے سامی برابر مصر آتے رہے تھے۔

آپ کا ہم عصر فرعون حضرت ابراہیمؑ کی آمد مصر کے وقت کون سا خاندان یا فرعون برسرِ اقتدار تھا اس کے متعلق بھی مختلف آراء ہیں۔ کینن لک کہتا ہے:

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابراہیمؑ گیارھویں اور تیرھویں خاندان کے ادوار کے بین بین مصر آئے ہوں گے اور بہت اغلب تو یہ ہے کہ بارھویں خاندان کے ابتدائی فراعنہ کے زمانے میں آئے تھے"

ڈونلڈ میکنزی کے خیال میں یہ زمانہ بارھویں خاندان کے فرعون سینوسرت دوم ($\frac{۲۶۸۴}{۲۶۶۰}$ ق-م) کا تھا ڈیویڈسن کی رائے میں آپ بارھویں خاندان کے فرعون سینوسرت سوم ($\frac{۲۶۶۰}{۲۶۲۲}$ ق-م) کے زمانے میں آئے۔ ڈی۔مورگن یہ وقت ہائیکسوس فرمانرواؤں کا قرار دے رہا ہے

ہماری اپنی رائے میں بھی یہ زمانہ کسی ہائیکسوس بادشاہ کا ہی ہو سکتا ہے
اور ہم نے یہ خیال متعدد وجوہات کی بنا پر قائم کیا ہے ایک تو یہ کہ حمورابی
اور فراعنہ مصر کے گیارھویں اور بارھویں خاندان کی تاریخیں میل نہیں کھاتیں۔
پھر یہ کہ مصر کے ہائیکسوس فرمانروا بھی عام نظریئے کے مطابق سامی خصوصاً
عرب تھے۔ گویا حضرت ابراہیمؑ اور ہائیکسوس ایک ہی نسل سے تھے۔
اسی لیئے فرعونِ وقت نے آپؑ کی بہت آؤ بھگت کی نہ صرف یہ بلکہ
بعد کے فراعنہ بھی حضرت یعقوبؑ و یوسفؑ کی قدر و منزلت کرتے رہے
اور یہ بھی کہ ابراہیمؑ کو اپنی لڑکی دینے والا فرعون سامی النسل ہی ہو سکتا تھا۔
کسی مصری نژاد حکمران کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایک آوارہ خرام سامی قبیلہ کے
سربراہ کو اپنا داماد بنا لیتا۔ فرعون کا اپنی لڑکی حضرت ہاجرہؑ کی شادی
ابراہیمؑ سے کر دینے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آپ نہ صرف نسبی لحاظ
سے ہی ارفع تھے بلکہ دنیاوی وجاہت کے بھی خاطر خواہ حامل تھے۔

مراجعت

مصر سے جب آپؑ جنوبی کنعان واپس ہوئے تو دنیاوی
جاہ و مال سے لدے پھندے تھے۔ واپسی پر بیت ایل،
اور عی، کے درمیان جب اس مقام پر پہنچے جہاں مصر جاتے ہوئے ایک
قربان گاہ تعمیر کر گئے تھے تو آپؑ کے اور حضرت لوطؑ کے ہمراہیوں
میں نزاع ہو گئی اور یہیں دونوں بزرگ فراست سے کام لیتے ہوئے
الگ ہو گئے۔ لوطؑ دریائے اردن کی وادی میں اور حضرت ابراہیمؑ بقیہ

سرزمین یعنی موجودہ فلسطین میں جا بسے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حبرون[1] میں بھی ایک قربان گاہ بنائی۔

مصر سے واپسی ہی پر حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ آپ حجاز گئے اور حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے اہم ترین واقعات رونما ہوئے یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی اور تعمیر کعبہ۔ مصر سے آپؑ کے لوٹ آنے کے بعد ہی بائبل کا وہ پہلا سیاسی واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حموربی، ندعال اور کدرلاعمر وغیرہ اپنی کامیاب مہم سے واپسی پر حضرت لوطؑ کو بھی گرفتار کر کے لے چلے۔

"جب ابرام نے سُنا کہ اس کا بھائی گرفتار ہوا تو اس نے اپنے تین سو اٹھارہ خانہ زادوں کو لے کر 'دان' تک ان کا تعاقب کیا اور رات . . . ان پر دھاوا کیا . . . ان کا پیچھا کیا۔ اور وہ سارے مال کو اور اپنے بھائی لوط اور اس کے مال اور عورتوں کو بھی . . . پھر لایا اور جب وہ کدرلاعمر اور اس کے بادشاہوں کو مار کر پھرا تو سدوم کا بادشاہ . . . آیا ــــ"

پیدائش $\frac{14}{16-14}$

---

[1] حبرون کو خلیل الرحمٰن یا الخلیل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مقام بیت المقدس کے جنوب مغرب میں بیس میل پر سے آج بھی موجود ہے۔ آج کل اس کی آبادی قریباً اٹھارہ ہزار ہے۔

اس جگہ متعدد امور قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ عجیب لطیفہ ہے کہ بائبل کا وقائع نگار حضرت لوطؑ کو ابراہیمؑ کا بھتیجا بتلانے کے بعد اب اچانک بھائی کہنے لگا ہے۔ بہرحال اہم نکتہ تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ صلح پسند اور صلح جُو ہونے کے ساتھ ساتھ بوقتِ ضرورت طاقت کے صحیح استعمال سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ کتاب پیدائش کا یہ چودھواں باب بائبل کی پہلی پانچ کتابوں میں دراصل نمایاں اہمیت و خصوصیت کا حامل ہے اور صرف یہی وہ باب ہے جس سے حضرت ابراہیمؑ کی عسکری صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہی باب ہے جو مغربی ایشیا کی اوّلین سیاسی حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے اور اس میں حضرت ابراہیمؑ کا واسطہ جن بادشاہوں سے دکھایا گیا ہے وہ تاریخ کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ البرائٹ وغیرہ کا چودھویں باب کے اس واقعہ کے متعلق یہ خیال ہے کہ کوئی کنعانی کتبہ ایسا ہوگا۔ جس پر یہ واقعات درج تھے اور بائبل کے وقائع نگار نے اس کتبہ سے یہ واقعہ لے لیا۔ لیکن دیگر نقّاد مثلاً نولدیکے وغیرہ اسے قطعاً غیر تاریخی اور بہت بعد کی پیداوار قرار دے رہے ہیں۔ ویوہاسن اور اس کے ہم نواؤں کا رجحان یہ ہے کہ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں میں آخری مرتبہ جو اضافے کیے گئے تھے۔ پیدائش کا چودھواں باب انہی میں سے ایک ہے۔

آپ کے متعلق مختلف نظریے

مؤرخین نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق مختلف نظریے پیش کیے ہیں:

(د) انھیں اموری سردار مانا گیا ہے۔

(ب) آپ کو عراق سے سامیوں کی ہجرتِ عظیم کا سربراہ کہا گیا ہے

(ج) اور یہ بھی کہ ابراہیمؑ کا وطن مالوف دراصل حبرون تھا اور بائبل میں درحقیقت ابرام اور ابراہام نامی دو مختلف ہستیوں کے حالات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور یہ خیال بعض محققین کو اس لیے گزرا کہ بائبل میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ابرام اور ابراہام دو جداگانہ ناموں سے آیا ہے:

لیکن الوہسٹ کے خیال میں حضرت ابراہیمؑ کو ابتداً ابرام کہتے تھے بعد میں آن کر اسرائیلیوں نے ابرام کہنے اور لکھنے پر سخت پابندی عائد کر دی اور اس طرح آپؑ کا نام ابراہام مروج ہو گیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۰ء ایڈیشن) کا مقالہ نگار لفظ ابرام کو بابلی اور ابراہام کو کنعانی شکل قرار دے رہا ہے۔ ویسے ابرام کے معنی 'پدر بزرگوار' اور 'ابراہام' کے معنی عبرانی میں 'قوموں کا باپ' کے ہیں۔

اب ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور دیگر پیغمبرانِ کرام مثلاً اسحٰقؑ و یعقوبؑ کے تاریخی وجود سے ہی سرے سے منکر ہے۔ وان بوہلن، ڈوزی اور جے ہیوٹ وغیرہ کے خیال میں ابراہیمؑ ایک افسانوی کردار ہے اور بس۔ جے ہیوٹ کا کہنا ہے:

"راما اس تاجر قوم 'شوس' کا باپ دیوتا تھا جو پاکستان اور فرات کے ڈیلٹا میں آباد تھی۔ یہی خدا 'راما' ہے جو عبرانی 'دیومالا' میں

ابرام بن تارح بن نحور بن گیا۔ نحور سے مراد ہے دریائے فرات اور تارح دراصل وہ ہرن ہے جو کچھ دریائی اقوام کا ٹوٹمی معبود تھا۔ — اکادیوں کے ہاں اس ہرن کا نام 'دارا' تھا۔ یہودی اسی کو تارح یا تیراہ کہنے لگے۔ یہی راما اشوریوں میں 'رام انا' (خدائے رام) اور اکادیوں میں 'مرمر' کہلایا۔ ہندو اسے دوہرے نام 'رام رام' سے پکارتے تھے۔ سنسکرت میں 'راما' تاریکی یا ظلمت کو کہتے ہیں اور عبرانی میں اس کا مطلب ہے 'سربلندیاں'۔

یہ 'باپ خدا' رام کا کیشیا والوں کی بادلوں کی دیوی 'سارہ' یا 'سارا' سے بیاہا گیا تھا۔ ان سے اسحٰق پیدا ہوا اور اسحٰق 'آز' یا عیسو اور یعقوب کا باپ بنا۔ عیسو بکریوں کا دیوتا تھا اور یعقوب بابیوں کا سورج دیوتا 'ایا' تھا۔ یعقوب نے حاران کے چاند دیوتا 'لابان' کی بیٹوں لیاہ (وحشی گائے) اور راخل سے بیاہ رچایا۔"

گویا محقق مذکور کی رائے میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور ان سے متعلقہ واقعات کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ یہ سب کچھ قدیم دیومالائی روایات سے نچوڑ کر ایک حقیقی ہستی کے روپ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کچھ علما تو اس حد تک آگے جا چکے ہیں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو اصنام پرست

ا

قرار دے رہے ہیں۔ لیوی سپنس کی رائے ہیں:

"اُر (کا شہر) چاند دیوتا یعنی مُنر کے عظیم پرستاروں میں سے تھا جہاں سے (حضرت) ابراہیمؑ نے ہجرت کی اور ممکن ہے کہ وہ (ابراہیمؑ) اصلاً چاند دیوتا کے پرستار رہے ہوں[1]۔"

سر لیونارڈ وولی کے الفاظ ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ توحید پرست نہ تھے بلکہ ایک بُت کے پرستار تھے اسی بُت کی پُوجا نے آگے چل کر توحید پرستی کی شکل اختیار کر لی۔" بحوالہ نگار (خدا نمبر)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ مغربی علماء کا یہ اندازِ فکر محض اُن کے 'دماغی فتور' یا لامذہبیت کی بنا پر ہے۔ یہ بات نہیں بلکہ بات اصل میں یُوں ہے کہ بائبل جُملہ پیغمبروں کو عام طور پر جس عامیانہ اور بسا اوقات جس مکروہ انداز میں پیش کر رہی ہے وہ قرآن کے اندازِ فکر سے قطعاً مختلف ہے۔ اکثر مغربی علماء کی نظر صرف بائبل تک اُٹھ کر رہ جاتی ہے اور محض بائبل کے مطالعہ سے پیغمبروں کے متعلق جس قسم کے خیالات و نظریات دماغوں میں ابھرتے ہیں وہ نہ تو اخلاقی لحاظ سے ہی صحت مند ہوتے ہیں اور نہ نظریۂ توحید پر پورے اُترتے ہیں۔

---

[1]

بائبل اور قرآنی واقعات کے طرزِ بیان میں جو نمایاں اور بنیادی فرق ہے وہ — "فلپ کے ہٹی" کے الفاظ سے واضح ہو جائے گا جو اس نے قصص قرآن کے متعلق کہے ہیں:

"یہ تمام نصیحت آموز کہانیاں (پیغمبروں سے متعلق) محض قصہ گوئی کی خاطر بیان نہیں ہوئیں بلکہ درسِ اخلاق دینے اور یہ بتلانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ ازمنہ گزشتہ میں خدا نے ہمیشہ راست بازوں کو اپنی عنایات سے نوازا ہے اور بدکرداروں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا ہے . . . یوسفؑ کی کہانی بہت ہی دلچسپ اور حقیقی پیرائے میں آئی ہے۔"

"ہسٹری آف دی عربس" ص ۱۲۵

بہر حال مذکورہ پیغمبرانِ عظام کا صحیح مقام اور عظمت، جانچنے کا معیار قرآن ہے نہ کہ بائبل —

آپؐ نہ کسی ملک کے بادشاہ تھے اور نہ آپؐ کو غیر معمولی دنیاوی وجاہت حاصل تھی، اس کے باوجود جو شہرت اور جو ہمہ گیر مقبولیت آپؐ کو حاصل ہے وہ دُنیا کی اور کوئی بھی ہستی نہیں پا سکی ہے۔ آج بھی سب سے زیادہ عقیدت کیش آپؐ ہی کے ہیں۔ کرشن اور رام صرف ہندوؤں کے ہیں موسیٰؑ اسرائیلیوں اور مسلمانوں میں مکرم ہیں۔ بدھ کے نام سے غیر بدھی قریباً ناآشنا ہیں۔ عیسیٰؑ سے عیسائی اور مسلمان مانوس ہیں لیکن رسول کریمؐ

مسلمانوں کے محبوب و مطلوب ہیں لیکن حضرت ابراہیمؑ کی ذاتِ اقدس ایسی ہے جو کسی نہ کسی رنگ میں قریباً ان سب قوموں کی ہے۔ یہ سب اس نام سے مانوس و متعارف ہیں۔

آپؑ کثیر الاولاد تھے حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے آپ کے سب سے بڑے لڑکے اسمٰعیلؑ (بمعنی خدا سنتا ہے) حضرت سارہؑ (بمعنی شاہزادی) سے اسحٰقؑ اور تیسری بیوی قطورہ کے بطن سے زمران، یقسان، مدان، مدیان اسباق اور شوخ پیدا ہوئے۔ آپؑ نے ۱۷۵ برس کی عمر پائی اور حضرت اسمٰعیل و اسحٰقؑ نے آپؑ کو اسی غار یعنی مکفیلہ میں دفن کیا جہاں حضرت سارہؑ مدفون تھیں۔ حضرت سارہؑ کی موت حبرون میں ہوئی۔ ابراہیمؑ نے آپ کی قبر کے لیے حتی قوم کے ایک شخص عفرون سے مکفیلہ نامی غار معہ اس سے متعلقہ کھیت کے، چار سو مثقال چاندی کے عوض خرید لیا تھا۔ یہ غار حبرون کے سامنے ہی تھا بعد میں یہ مکفیلہ غار حضرت ابراہیمؑ کا خاندانی گورستان بن گیا اور حضرت اسحٰقؑ و یعقوبؑ وغیرہ بھی یہیں دفن کیے گئے۔

آلِ ابراہیمؑ

تارح

حاران — ابراہیم — نخور

حاران: لوطؑ

لوطؑ: موآب — بن عمّی

نخور: بیتوایل

بیتوایل: لابن — ربقہ (زوجہ اسحٰقؑ)

لابن: لیاہ (زوجہ یعقوبؑ) — راخل (زوجہ یعقوبؑ)

ابراہیم: یقسان — مران — زمران — اسمٰعیلؑ — اسحاقؑ — اسباق — سوخ — مریان

یقسان: سبا — دوان

مریان: عیفاہ — عفر — حنوک — ابیداع — الدوعا

اسمٰعیلؑ: نبایوت — ادبائیل — مبسام — مشماع — حدود — تیما — قیدار — یطور — قیدمہ — نفیس — یقیم — نایاہ (زیادہ)

عدنان (یہ حضرت اسمٰعیل کی چالیسویں پشت میں تھے)

|

معد

|

نزار

|

مضر

(سلسلہ نسب آئندہ صفحے پر)

الیاس

مدرکہ

خزیمہ

کنانہ
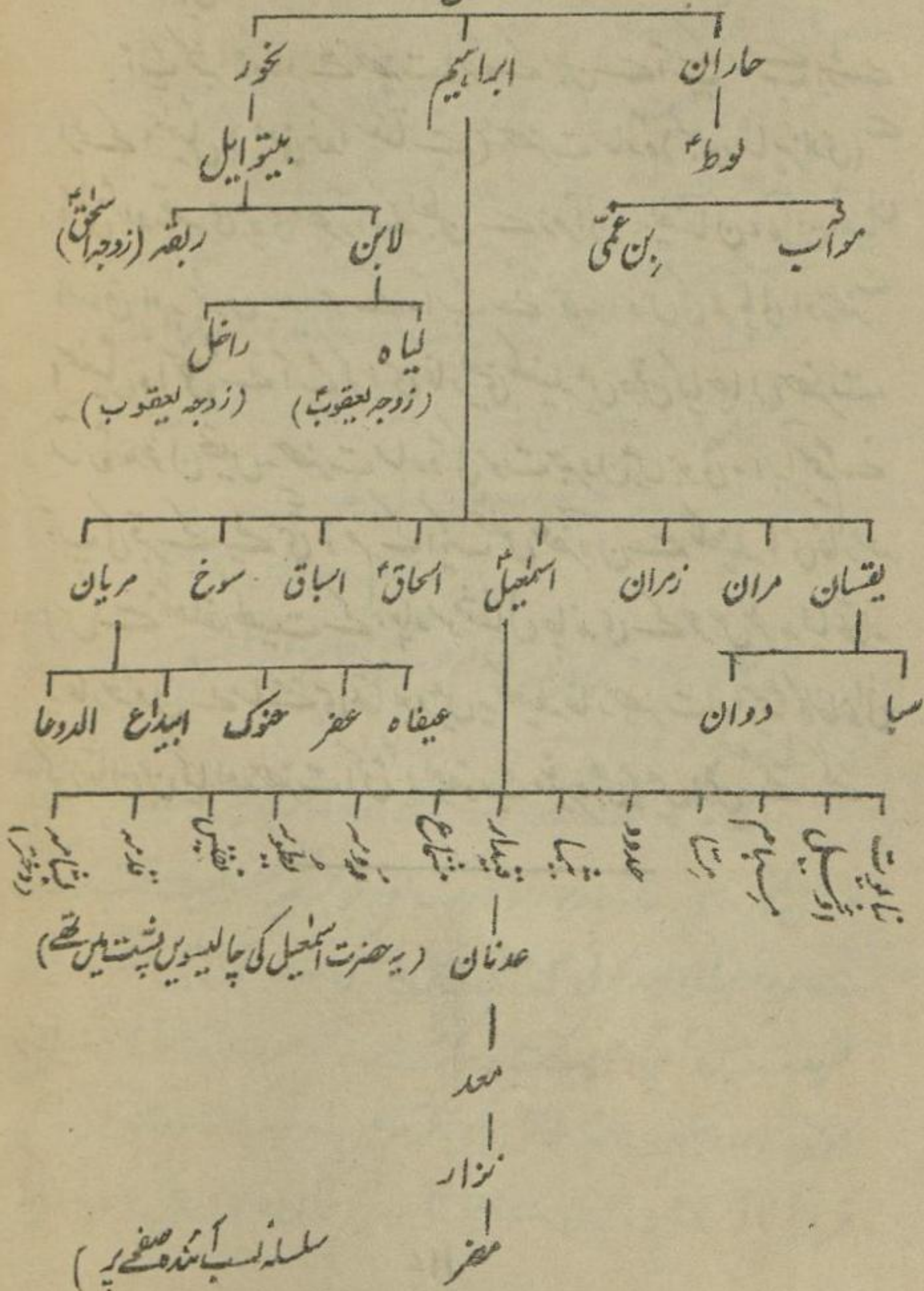
نضر

مالک

فہر (قریش)

قصی

ہاشم

عبدالمطلب

عبداللہ

رسولِ کریمؐ

(فہر کے بعد رسولِ کریمؐ تک ہم نے صرف چند معروف نام لکھے ہیں۔ ورنہ رسولِ کریمؐ سے فہر تک شجرۂ نسب یوں ملتا ہے:
محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدِ مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر)

(سلسلہ نسب آئندہ صفحے پر)

ابراہیمؑ

اسحٰقؑ

یعقوب — عیسو

عیسو: الیفز رعوایل یعوس یعلام قورح

یعقوب: روبن شمعون لاوی یوسفؑ یہوداہ اِشکار زبولون بنیامین دان نفتالی جد آشر دینہ (بیٹی)

یوسفؑ: منسّی افرائیم
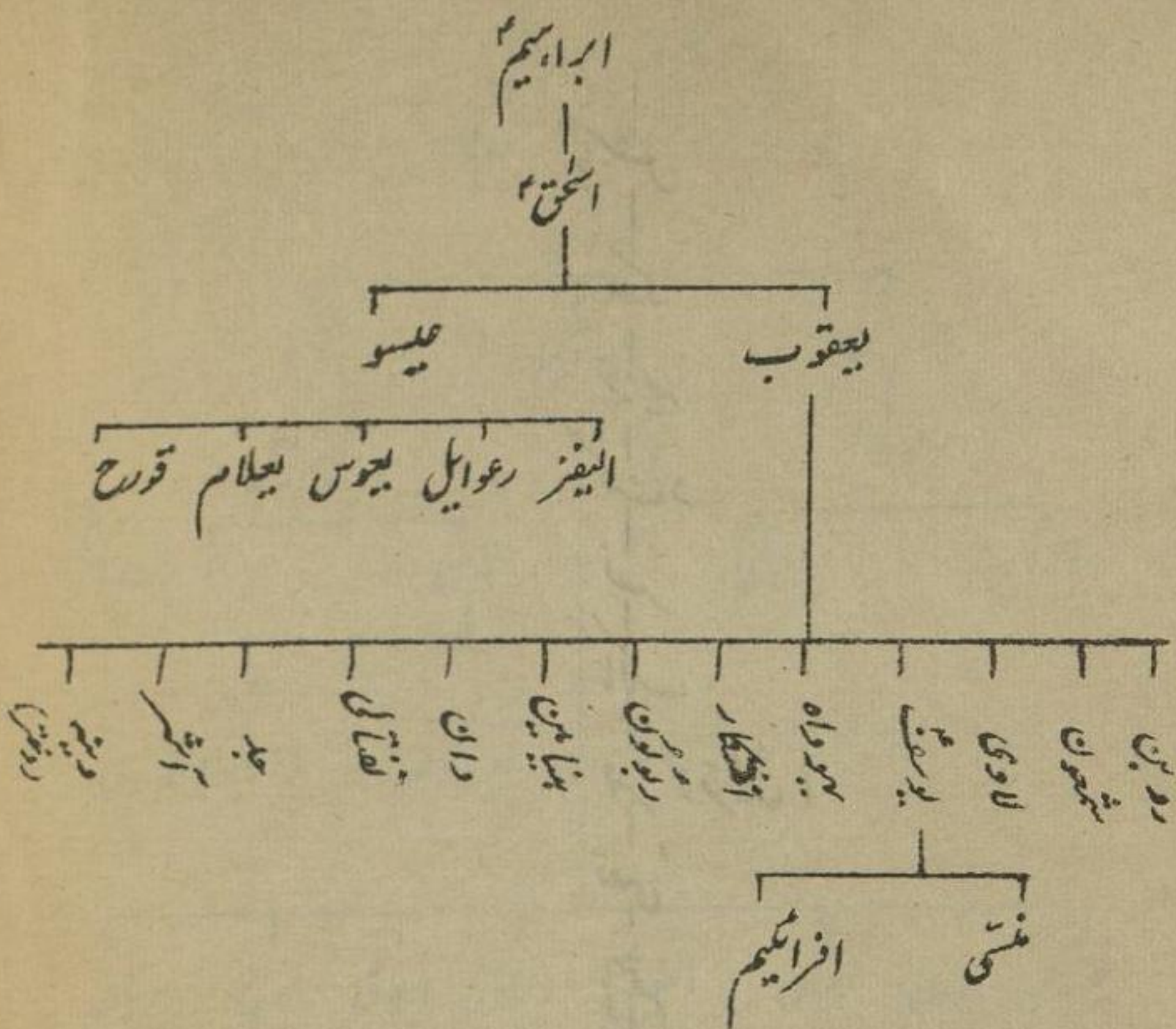
حضرت یوسفؑ اور ہائیکسوس

آپ نے مصر کے مستبد اور مضبوط جاگیرداری نظام
کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ آپ دُنیا کی پہلی
شخصیت ہیں جنھوں نے جاگیرداری اور انفرادی ملکیت
کو ختم کر کے سٹیٹ کی تحویل میں لے لیا ——

حضرت یوسفؑ اور ہائیکسوس

حضرت اسحٰقؑ[1]، حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے تھے۔ آپ کی شادی حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے بیتوایل بن نحور کی لڑکی ربقہ سے ہوئی۔ ربقہ کے بطن سے دو جڑواں لڑکے عیسو اور یعقوبؑ[2] پیدا ہوئے۔ عیسو ایک مردِ آزاد اور صحراؤں، جنگلوں اور سیر و شکار کا شیدائی تھا۔ اس نے متعدد شادیاں کیں۔ اس کی ایک بیوی محلت بنت اسمٰعیلؑ تھی۔

ماں چونکہ چھوٹے صاحبزادے یعقوبؑ سے زیادہ مانوس تھی۔ اس لیے حضرت اسحٰقؑ کے بعد حق نیابت انھیں مل گیا۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے ماموں لابن پسرِ بیتوایل کی دو بیٹیوں لیاہ اور راخل سے بیاہ کر لیا۔ ان دونوں کے علاوہ آپ کے 'حرم' میں بلہاہ اور زلفہ نامی دو خواتین بھی موجود تھیں۔ آپ کی اولاد کی تفصیل یہ ہے:

حرمِ اوّل لیاہ کے بطن سے رُوبن، شمعون، لاوی، یہوداہ، اشکار، اور زبولون۔ ان چھ بیٹوں کے علاوہ ایک دختر دینہ بھی تھی۔

---

[1] عبرانی میں اسحٰق کے معنی ہیں 'ہنسنا'۔ [2] یعقوب بمعنی 'ایڑی پکڑنے والا'۔

حرم دوم راخل کے بطن سے ۔۔۔ یوسفؑ اور بنیامین
حرم سوم بلہاہ سے ۔۔ دان اور نفتالی
اور چوتھی بیوی زلفہ سے ۔۔ جد اور آشر پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کے انہی بارہ بیٹوں سے وہ قبائل منسوب ہیں جو آگے چل کر بنی اسرائیل کہلائے۔

آپؑ کا زمانہ

اس موقعہ پر ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ آپؑ نے فراعنہ مصر کے کون سے خاندان کا زمانہ پایا ۔۔۔

ویگل ( ) کے خیال میں حضرت یوسفؑ سنہ ۱۹۵۹ ق م قید خانہ سے رہا ہوئے اور سرکاری عہدہ پایا۔ یہی سال بقول ویگل بارھویں خاندان کے فرعون آمنہیمت سوم کی تخت نشینی کا تھا[1]۔ ڈیویڈسن آپ کو اٹھارھویں خاندان کے نامور فرعون تھوتمس سوم کا ہم عصر قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں حضرت یوسفؑ کا سات سالہ قحط اسی زمانے میں پڑا۔ لکھتا ہے:

"سات سالہ قحط کے دوران میں، اپنی حکومت کے پچاسویں برس یہ عظیم فرمانروا بذریعہ جہاز نیل کی پہلی آبشار کی جانب روانہ ہوا تاکہ نیل میں

---

[1] محقق مذکور کے قول کے مطابق حضرت نے ۲۱۱۱ ق-م میں مصر چھوڑا تھا جو بارھویں خاندان کے بانی آمنہیمت اوّل کا سالِ تخت نشینی ہے۔

پانی کی کمی کا وہ سبب معلوم کرے جس کی وجہ سے دورانِ قحط میں مصر ضروری سیلابی پانی اور حاصل خیز سیلابی مٹی سے محروم رہ گیا تھا اس نے مجرمین کو سزائیں دیں اور ٹوٹے ہوئے بیراج سے ایک نئی نہر نکالی اور متصل جزیرہ "سیہل" میں ایک کتبہ نصب کرایا۔ کتبہ میں لکھا ہے:

"نویں مہینے، بائیسویں دن اور پچاسویں برس ۔ اعلیٰ حضرت من کفر را (تومنس سوم) نے اس نہر کو کاٹنے کا حکم دیا جو پتھروں سے اس طرح پٹی پڑی تھی کہ کوئی جہاز اس میں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ "ایلیفنٹائن" کے مچھیروں کو ہر سال صفائی کرنے پر مجبور کیا ہے۔"

اس کتبہ کی تاریخ ۲۴ر اپریل ۱۶۹۶ ق۔م ہے۔ اسی جزیرۂ سیہل میں اس کا ایک اور بڑا کتبہ ہے جس میں قحط کے جملہ اسباب و حقائق اور اس کی مدت بیان کی ہے۔ یہ دوسرا کتبہ بھی تومنس کے پچاسویں برس کا ہے اس میں لکھا ہے:

"مسلسل ساتویں برس تک مصر ایک خوفناک قحط کے پنجے میں گرفتار رہا۔ یہ قحط نیل کی پہلی آبشار میں رکاوٹ پڑجانے سے رونما ہوا۔ نیل کا پانی اس سبب بند ہوا کہ باشندوں نے نیل کے مقامی دیوتاؤں کی پوجا ترک کردی تھی اور قحط دیوتاؤں کے غیظ و غضب کی وجہ سے پڑا۔"

اس سے آگے لکھا ہے کہ فرعون نے نیل کے مقامی دیوتاؤں کی پرستش
کو پھر سے بحال کیا اور ان کے لیے منار تعمیر کرائے۔ پجاریوں میں
اجناس اور جاگیریں تقسیم کیں[1]۔"

یہ ہے ڈیویڈسن کا طویل بیان۔ لیکن اس کتبہ کے علاوہ اس حضرت
یوسفؑ کے تو تمس سوم کے ہم عصر ہونے کا اور کوئی دلیل نہیں دی۔ گویا
محقق مذکور نے صرف اس کتبے کی عبارت پر اپنے نظریئے کی عمارت کھڑی
کی ہے۔ تو تمس کے جملہ سرکردہ امراء کے نام بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔
ان میں کہیں بھی حضرت یوسفؑ یا ان سے ملتا جلتا کوئی نام موجود نہیں
ہے۔ علاوہ ازیں تو تمس سے پہلے اسرائیلیوں کی ایک ہجرت مصر سے
ہو چکی تھی۔ جو حضرت یوسف کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ پھر یہ کہ مصر
ایک بار ہی تو قحط کی لپیٹ میں نہیں آیا۔ وہاں تو متعدد قحط پڑے ہیں چنانچہ
انہی میں سے ایک قحط وہ تھا جس کا ذکر تو تمس نے مذکورہ کتبے میں کیا
ہے لیکن اس سے یہ لازم کب آجاتا ہے کہ یہی قحط یوسفؑ تھا۔
سوال کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا نام بھی تو کسی اور فرعون کے
کتبوں سے نہیں مل رہا۔ اس کے متعلق تو یہ ہے کہ چونکہ آپ کسی ہائکسوس
فرمانروا کے عہد میں ہوئے اور مصر کے نظام جاگیرداری کو ختم کر دینے کے

---

[1]

باعث چونکہ آپ مصریوں میں بہت غیر مقبول تھے اس لیے ہائیکسوس کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ مصریوں نے حضرت یوسفؑ کی بھی برباد کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ ممکن ہے کہ ماضی میں آپؑ سے متعلقہ کوئی کتبہ یا پیپرس ہاتھ آجائے۔

مؤرخین کی غالب اکثریت تسلیم کر رہی ہے کہ حضرت ابراہیم کی طرح حضرت یوسفؑ نے بھی ہائیکسوس فرمانرواؤں کا زمانہ پایا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس اور درست بھی ہے۔ کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ کو اپنی بیٹی اور یوسفؑ کو وزارت جیسا اہم عہدہ سونپنے والے فرعون غیر مصری خصوصاً سامی ہی ہو سکتے تھے۔

یعقوبؑ کی اثری شہادت

فرعونوں کے مصر میں ایک معمول تو یہ تھا کہ بھنورے نما ترشے ہوئے ہیروں پر لوگوں کے نام لکھے جایا کرتے تھے۔ لیکن یہ نام صرف فرعونوں یا بہت اونچے لوگوں کے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی بھونرے نما ترشا ہوا ایک ہیرا ہائیکسوس فرعون کے زمانے کا ملا ہے۔ اس پر یعقوب ایل نام لکھا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نام حضرت یعقوبؑ کا ہو۔ چونکہ آپ وزیر مصر حضرت یوسفؑ کے والد ہونے کی وجہ سے نمایاں اہمیت رکھتے تھے اس لیے ہیرے پر آپؑ کا نام پایا جانا چنداں تعجب خیز اور بعید از قیاس نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اس سے مراد حضرت

یعقوبؑ نہ بھی لیں تو بھی یہ امر تو یقینی ہو جاتا ہے کہ اسرائیلیوں کے یعقوبی قبائل میں سے کسی ایک کا سربراہ یہ شخص یعقوب ایل تھا جو کسی ہائیکسوس فرمانروا کے عہد میں کلیدی آسامی پر فائز تھا۔ اور ہائیکسوس کے زمانے میں اسرائیلی مصر میں آباد تھے۔

خود بائبل سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت یوسفؑ کا فرعون ہائیکسوس ہی میں سے تھا۔ جب حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹے مصر میں حضرت یوسفؑ کے پاس آتے ہیں تو آپؑ نے تاکید کی :

"پس جب فرعون تم کو بلا کر پوچھے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے تو تم یہ کہنا کہ تیرے خادم ہم بھی ہیں اور ہمارے باپ دادا بھی لڑکپن سے لے کر آج تک چوپائے پالتے آئے ہیں۔"

پیدائش $\frac{46}{34 ,33}$

عبارت کا انداز صاف بتلا رہا ہے کہ یہ فرعون مصری نژاد کسی طرح نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے برعکس ایسی نسل سے تھا جس کا پیشہ چوپانی رہ چکا تھا۔

فلنڈرس پیٹری کے الفاظ میں :

"حضرت یوسفؑ کسی ہائیکسوس فرعون کے دور میں ہو گزرے ہیں یہ اس بابلی خطاب سے بھی ظاہر ہے جو انھیں دیا گیا یعنی ابرک۔ ابرک دراصل بابلی لفظ 'ابارخو' سے نکلا ہے جو ملک کے

پانچ عظیم عہدہ داراں میں سے ایک کا لقب ہوتا تھا"۔[1]

ہائیکسوس کون تھے؟

اس موقعہ پر ہائیکسوس خاندان کا ذکر ذرا تفصیلی کرنا ہوگا اس لیئے کہ یہی وہ خاندان ہے جس کے دور میں خانوادہ براہیمیؑ کے پانچ پیغمبران عظام ہو گزرے ہیں اور ان میں سے ابراہیمؑ، یعقوبؑ اور یوسفؑ تو نہ صرف مصر آئے بلکہ انھیں یہاں بہت اہمیت بھی حاصل رہی۔

مصریوں نے کم وبیش دو ہزار برس تک اپنی قومی اور آزاد شہنشاہیت کا لطف اُٹھایا تھا کہ ہائیکسوس کی غلامی کا جوا گلے میں آن پڑا۔ یہ ہائیکسوس کون تھے؟ یہ اہم اور دلچسپ سوال موضوع بحث بنا ہوا ہے قدیم مصری مؤرخ اور کاہن مانیتھو نے نہ صرف جملہ شاہانِ مصر کی فہرست ہی دی ہے بلکہ اُس نے ہائیکسوس کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کی اصل تاریخ تو اب ناپید ہے۔ البتہ اس کے جستہ جستہ اقتباسات اور کچھ حصے دیگر قدیم مؤرخین کی تاریخوں میں اب بھی مل جاتے ہیں۔ انہی مورخوں میں سے ایک یہودی مورخ جوزفس ہے جس نے مانیتھو کے حوالے سے ان ہائیکسوس کے متعلق لکھا ہے:

"ہمارے بادشاہ طیماؤس کے زمانے میں خدا معلوم کیوں ہم سے ناراض ہو گیا کہ اچانک مشرقی ملک سے کم ذات، لوگ ہمارے

---

[1]

ملک میں ور آئے اور بغیر کسی جنگ کے بآسانی ملک پر قابض ہو گئے۔
اُنھوں نے ہمارے سرداروں کو کچل ڈالا۔ شہر نذرِ آتش کر دیے
اور معبدوں کو مسمار کر کے رکھ دیا۔ سب کے ساتھ وحشیانہ پیش
آئے کچھ لوگ مار دیے اور کچھ معہ عورتوں اور بچوں کے غلام
بنا لیئے ۔"

بالآخر انھوں نے اپنے میں ہی کا ایک آدمی سلاطیس، بادشاہ
مقرر کر لیا۔

(۱) اور سلاطیس نے ۱۹ سال حکومت کی
(۲) اس کے جانشین بنون نے ۴۴ سال حکومت کی
(۳) اپخناس نے ۳۶ سال حکومت کی
(۴) افوبیس نے ۶۱ سال حکومت کی
(۵) ایانیاس نے ۵۰ سال اور ایک ماہ حکومت کی
(۶) اسیس نے ۴۹ سال اور دو ماہ حکومت کی

یہ ان میں سے پہلے چھ بادشاہ تھے۔ یہ سب 'ہائیکسوس' یعنی چرواہے
بادشاہ کہلاتے تھے۔ 'ہائیک' کے معنی 'زبانِ مقدس' میں بادشاہ اور 'سوس'
عوامی زبان میں 'چرواہے' کے معنی دیتا ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ عرب تھے ان
چرواہے بادشاہوں اور ان کے جانشینوں نے مصر پر ۵۱۱ برس حکومت کی۔ [1]

---

[1]

گویا مانیتھو کے بیان کی رو سے یہ ہائیکسوس عرب تھے۔ بروغش اس سلسلے میں لکھتا ہے:

"عرب کے جو بدو مصر کے مشرقی صحرا میں رہتے تھے مصری انھیں 'شاسو' کہتے تھے اور یہ بدو یعنی 'شاسو' مختلف ادوار میں مشرقی جانب سے مصر میں داخل ہوتے رہے ہیں۔"

بروغش کی رائے میں 'ہائیک سوس' مصری لفظوں 'ہائیک شاؤس' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'عربوں کا بادشاہ یا چرواہوں کا بادشاہ'۔ پیٹری کے الفاظ میں:

"مانیتھو نے ہائیکسوس کے جو معنی دئے ہیں اس سے ہم ان کی اصل کے متعلق کچھ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ کون تھے۔ بعد کی یادگاروں پر 'شاسو' کو مخصوص عرب دکھایا گیا ہے۔"

جلد اول صفحہ ۲۳۷

بقول بروغش "ایک عرب روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شداد (بمعنی مضبوط حکمران) نامی ایک شخص نے مصر فتح کیا اور آبنائے جبرالٹر تک فتوحات حاصل کرتا چلا گیا"۔ اسی نکتہ کو علامہ نادوی نے ارض القرآن جلد اول کے صفحہ ۱۵۰ پر بالتفصیل بیان کیا ہے۔

افریکینس جو، مانیتھو کے خوشہ چینوں میں سے ایک ہے۔ ہائیکسوس کو فینیقی بتلاتا ہے۔ اس کی یہ روایت بھی ایک حد تک صداقت سے خالی

نہیں ہے۔ شاسوعوب، اور فنیونیقی مغرب میں قصبہ زورتانیث تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ یعنی اول الذکر خانہ بدوشوں کی حیثیت سے اور موخرالذکر مدنیت اختیار کیئے مشرقی صوبوں میں رہ رہے تھے اور یہ صوبے ان غیر ملکیوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ روزبلینی وغیرہ ہائیکسوس کو مخلوط تورانی اور سامی بتلا رہے ہیں جنھوں نے مغربی ایشیا سے مصر کا رُخ کیا۔ اس لیئے کیا کسان کے اپنے ملکوں میں آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو انھیں آریہ قرار دے رہا ہے۔ اس ضمن میں مصر کے ایک موجودہ مشہور جرنلسٹ اور ماہر آثار قدیمہ نو خارجی سیانی نے فروری ۱۹۵۶ء میں آریہ قرار دیتے ہوئے

مندرجہ ذیل دلائل دیئے:

(ا) ہائیکسوس خدائے نور "سورج" یعنی آفتاب کو پوجتے تھے اور اس "سورج" کی پوجا اور اس سے متعلقہ عقائد نہ تو سامی ہیں اور نہ مصری۔ (اس کے برعکس بروعش وغیرہ "سورج" اور مصری دیوتا "ست" کو ایک ہی تسلیم کر رہے ہیں)

(ب) گھوڑا ہائیکسوس کے نزدیک مقدس جانور تھا اور وہ اس کی قربانی کرتے تھے۔ اس خصوصیت کی بنا پر ان کا رشتہ "پاک ہندی اور یورپی" لوگوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

(ج) ہائیکسوس کے بنوائے ہوئے قلعوں کی طرز تعمیر مصری اور سامی

خصوصیات سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ طرزِ تعمیر، یورو ایشیاٹک میدانوں
کی خصوصیت ہے۔

(د) مشہور ہائیکسوس سلاطین کے نام سامی، اموری، فینیقی، اشوری حطی، حتی کہ ہائیکسوس کی ہم عصر مشرق قریب کی کسی بھی قوم سے نہیں ملتے۔

(ک) مصری علاقہ "دگوشن" کا نام دراصل آریائی ہے سنسکرت میں دگوشن، مویشیوں کے باڑے کو کہتے ہیں۔

بہرحال موجودہ علماء کی اکثریت کے علاوہ خود قدیم مصری اور عرب مورخین کی رائے یہ ہے کہ یہ حملہ آور چرواہے بادشاہ عرب تھے۔ بائبل کا بیان بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے جسے ہم تفصیل کے ساتھ پیچھے بیان کر آئے ہیں۔

لیکن ہم راٹنسن وغیرہ سے متفق ہیں کہ یہ خالص عرب نہیں تھے بلکہ متعدد ملے جلے قبائل تھے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی رہنمائی عربی نژاد لیڈر کر رہے تھے۔ یا یہ کہ بیشتر حملہ آور عرب تھے۔ جارج راٹنسن کے الفاظ میں:

"مصری ان حملہ آوروں کو "سنتی" یا "سانی" کہتے تھے لیکن ان مبہم ناموں سے ان کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ لوگ اٹیلا کی فوج کی طرح بہت سی مختلف النوع قوموں یا نسلوں کا مجموعہ تھے۔ یہ الفاظ دیگر ہائیکسوس اہل عرب و شام کے

علاوہ تمام خانہ بدوش چوپان قبیلے شریک تھے جو متمول غنیم اور ہر حاصل خیز سرزمین پر چڑھ دوڑنے کے لیے ہمہ وقت اٹل بیٹھنے کو تیار تھے۔[۱]

پیٹری نے ہائیکسوس کا دور ۲۰۹۸ ق۔م سے لے کر ۱۵۸۷ ق۔م تک قرار دیا ہے اور ان کے چھ نامور سلاطین نے ۱۹۹۰ ق۔م سے ۱۷۳۰ ق۔م تک دو سو ساٹھ برس حکومت کی۔

واقعۂ زلیخا حضرت یوسفؑ کو لے کر جب اسمٰعیلی سوداگر مصر پہنچے تو آپؑ کو ان سے فرعون کے ایک امیر فوطیفار نے خرید لیا۔ اسی فوطیفار کے گھر میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں ناکردہ گناہ زندان کے سپرد کر دیا گیا۔ یہی واقعہ دراصل آپ کے عروج و عظمت کا سنگِ بنیاد ہے اور بقول بیرسی یہ یوسفؑ زلیخا کے واقعے سے بہت ملتا جلتا اس زمانے کا ایک واقعہ لکھا ملا ہے جو بروغش کے الفاظ یہ ہیں:

"بہرحال ایک مخصوص پیرائے میں حضرت یوسفؑ کی تاریخ سے مطابقت رکھتا ہے۔ یوسفؑ اور تبا کا تقویٰ اور ان کی مدافعت میں اس قدر گہری مماثلت نظر آ رہی ہے کہ اغلب گمان یہی گزرتا ہے کہ دونوں روایات کا ماخذ ایک ہی ہے۔"

---

[۱] ط

ہم سمجھ نہ سکے کہ بروغش نے دونوں واقعات کا ایک ہی مخرج کیسے قرار دے لیا۔ اتفاق سے اگر ایک ہی وقت میں بنی مصر میں ایک جیسے دو واقعات پیش آ گئے ہوں تو ان کو ایک کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ اس زمانے کی مصری عورتوں میں عام بدچلنی پھیلی ہوئی تھی۔

مصری قصہ یوں بیان ہوا ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی اپنے چھوٹے کنوارے بھائی "بتا" کو کھیت سے گھر بیج لانے کے لیے روانہ کرتا ہے:

"۔۔۔۔ اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا 'جلدی کر اور گاؤں سے بیج لے آ'۔ وہ گھر آیا تو اس کی بھابی بال سنوار رہی تھی۔ اس نے (بھابی) سے کہا 'اٹھ اور مجھے بیج دے تاکہ میں کھیت لوٹ جاؤں کیوں کہ بھائی کا یہی حکم ہے کہ فوراً واپس پہنچوں'۔ عورت بولی: 'اندر جا صندوق کھول۔ تاکہ تو وہ کچھ لے لے جو تیرا دل چاہتا ہے، ورنہ میری زلفیں زمین پر بکھر جائیں گی'۔ نوجوان (طویلے کے) اندر گیا اور ایک بڑا برتن اٹھایا۔ کیوں کہ وہ بہت سارے بیج لے جانا چاہتا تھا۔ وہ (سارا) گیہوں اور باجرہ خود ہی اٹھا کر باہر نکل آیا۔ وہ بولی 'افوہ! کس قدر بوجھ لدا ہے تیرے بازوؤں پر۔' وہ بیان نے باجرہ اور تین پیمانے گیہوں'۔ کیا ٹھکانہ ہے تیری طاقت کا۔ میں نے تیری

قوت کا کئی بار مشاہدہ کیا ہے "۔ وہ اُٹھی اور اس کا ہاتھ تھام کر
بولی "آ ۔ گھنٹہ بھر آرام ہی کریں ۔ خوبصورت چیزیں تیرے
پہلو کی زینت ہوں گی ۔ کیونکہ میں تیری خاطر ضیافتی جوڑا زیب تن
کروں گی "۔ عورت کے یہ شیطانی کلمات جو اس نے سُنے تو
چیتے کی طرح بپھر گیا ۔ "تو ؟ ۔ اے عورت تو میری ماں کی
جگہ ہے اور تیرا شوہر بجائے باپ کیوں کہ وہ مجھ سے بڑا ہے ۔
تُو نے یہ گناہ آلود باتیں مجھ سے کیں کیوں ؟ ۔ پھر ایسی بات
نہ ہو ۔ اس مرتبہ تو میں یہ بات کسی سے نہیں کہنے کا اور اس کے
متعلق کسی کے سامنے ایک لفظ تک میرے منہ سے نہیں نکلے گا
۔ وہ بوجھ اُٹھائے نکلا اور چلا گیا ۔

دونوں بھائیوں نے دن بھر کا کام ختم کیا ۔ شام ہوئی تو بڑا گھر
لوٹا ۔ چھوٹا بھائی بیلوں پہ کھیت کی اچھی اچھی چیزیں لادے
ان کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا ، تاکہ گاؤں کے باڑے میں بیلوں
کے لیئے اچھی سی جگہ بنائے ۔ اس کے بڑے بھائی کی بیوی جو
اپنی گفتگو کے سبب خائف تھی ۔ روغن بھرا برتن پی گئی اور ایسی
بن گئی جیسے کسی کی شیطنت کا شکار رہی ہو ۔ وہ اپنے خاوند
سے کہنا چاہتی تھی کہ تیرے چھوٹے بھائی نے مجھے اپنی ہوس کا
شکار بنایا ہے ۔ حسبِ معمول اس کا خاوند شام کو گھر آیا تو بیوی کو

خستگی کے عالم میں لمبا پڑے دیکھا۔

بیوی نے معمول کے مطابق نہ تو ہاتھ دھلانے کے لئے شوہر کو پانی پیش کیا اور نہ موم بتیاں جلائی تھیں۔ گھر میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا، کس نے تیرے ساتھ یہ' (سلوک) کیا ہے — اٹھ کھڑی ہو' — تیرے چھوٹے بھائی کے علاوہ اور ہو کون سکتا تھا؟ اناج لینے آیا تو مجھے اکیلی دیکھ کر کہنے لگا چل گھڑی بھر لطف اندوز ہوں — چھوڑ اپنے بال — میں نے اسے سمجھایا — دیکھ تو سہی۔ کیا میں تیری ماں نہیں؟ — اور کیا تیرا بھائی تیرے لیئے بمنزلہ' باپ' نہیں؟ — لیکن اس نے میری ایک نہ سُنی اور میرے ساتھ جبر کیا، جو میں تجھے نہیں بتلا سکتی۔ اب اگر تو اسے زندہ رہنے دے گا تو میں مر رہوں گی۔ "

بر دعش اول ۶۸-۲۶۶

تبا اور آنپو کی مشہور طویل مصری حکایت کا یہ ادھورا اقتباس ہے جو یہاں درج کیا گیا ہے۔ واقعہ یوسفؑ سے مشابہت سے قطع نظر ان دونوں حکایتوں سے اس زمانے کے مصریوں کی روزمرہ کی اخلاقیات اور سوسائٹی کے متعدد گوشوں پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں زوجۂ آنپو اور فوطیفار کی بیوی (زلیخا) میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے اور دوسری جگہ بتا بھی حضرت یوسفؑ کی مانند بلند کرداری اور پاک دامنی کا ثبوت دے رہا ہے۔

مسندِ وزارت پر خواب کی تعبیر بتلانے کے سبب فرعون کے دربار میں آپؑ کی رسائی ہو گئی اور وہ آپ کی فہم و فراست اور ظاہری وجاہت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ رفتہ رفتہ آپؑ کو سب سے اہم ملکی عہدہ سونپ دیا۔ بائبل کا بیان تو کچھ اس قسم کا ہے جیسے فرعون نے پہلی ملاقات ہی میں آپؑ کو سیاہ و سفید کا مختارِ کل بنا دیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے آپؑ کو فرعون نے پہلے 'ابرک' کا عہدہ (اور لقب) دیا۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ملک کے پانچ اعلیٰ عہدوں میں سے ایک پر آپؑ کو فائز کیا اور پھر آپ اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی کر کے وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے۔ اور اس وقت تک امورِ مملکت کا خوب خوب تجربہ حاصل کر چکے تھے۔

فرعون نے آپ کو ایک اور خطاب دیا 'صفنات فعنیح'۔ اس لفظ کے کئی معنی بتلائے گئے ہیں مثلاً "بھید کا بتلانے والا"۔ 'دنیا کا نجات دہندہ'۔ بروغش اس لفظ کے معنی دیتا ہے 'زندگی کی جگہ کے ضلع کا گورنر'۔ نیوائل کے خیال میں اس کا مطلب ہے 'زندگی کے گھر کا آقا'۔ اور پروفیسر سٹائن ڈورف (   ) کے خیال میں یہ دراصل یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کا تلفظ بالائی مصر میں 'ضبنوت فونخ' تھا۔

حضرت یوسفؑ کے عہدہ یعنی وزارت کو مصر میں بے حد اہمیت حاصل

تھی۔ یہ عہدہ "آون" کہلاتا تھا اور فرعون کے بعد ملک میں وزیر ہی کا درجہ
تھا۔ رعایا وزیر کو اپنا محافظِ اعلیٰ سمجھتی تھی۔ اور سب سے بڑی دُعا ہی وہ
سمجھی جاتی تھی جب آمن دیوتا کے حضور لوگ دست بستہ وزیر کے
حق میں دُعا کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے "غریبوں اور بے کسوں کا
وزیر — جو مجرم سے کسی طرح کی بھی رشوت قبول نہیں کرتا۔" وزیر چیف جسٹس
بھی تھا اور خزانہ، حرم شاہی، فرعون کے کارخانوں، بیڑے کے سرداروں
اور پیدل فوج کا انچارج بھی۔

مصر کی وزارت سے حضرت یوسفؑ کی زندگی کا اہم ترین دَور شروع
ہوتا ہے۔ فرعون کے بعد حضرت یوسفؑ کو ملک میں سب سے بڑھ کر
اہمیت حاصل تھی۔

قحطِ یوسفؑ

حضرت یوسفؑ کی زیادہ شہرت و عظمت، دراصل دورانِ
قحط ان کے حسنِ تدبر اور بہ طریقِ احسن انتظامِ حکومت
انجام دینے کی وجہ سے ہے۔

شمالی عرب، کنعان، ابی سینیا اور مصر تو کئی بار قحط کی زد میں آتے
رہے ہیں۔[1] بروغش نے ایک ایسے کتبہ کا ذکر کیا ہے جس میں قحط کا

۱؎ مصر سے ایک تختی برآمد ہوئی جس سے تیسرے خاندان کے زمانے میں ایک قحط
کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن اب وہ رومی عہد کا ایک زبردست فراڈ ثابت (بقیہ بر صفحہ ۱۴۰)

ذکر ہے اور محقق مذکور اس قحط کو حضرت یوسفؑ کا قحط قرار دے رہا ہے یہ کتبہ ایک مصری امیر بابا نامی کے مقبرے میں موجود ہے۔

بابا لکھتا ہے،

"شاہزادوں کی (طعام) میز کا سردار — بابا — دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا ہے، یوں گویا ہوتا ہے کہ —— میں نے اپنے باپ سے محبت کی، ماں کا احترام کیا۔ میرے بھائی بہنوں نے مجھے چاہا میں اپنا دردمند اور فیض رساں دل لیے باہر نکلا— اور وہاں تازہ ہاتھوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ دعوت کے دن کے لیے

(بقیہ حاشیہ ۱۳۹) ہوئی ہے۔ یہ جھوٹا قصہ دراصل حضرت یوسفؑ کے واقعہ سے لیا گیا تھا کہ فرعون زوسر نے ملک کی (خستہ) حالت سے افسردہ ہو کر نوبیا کے ایک گورنر سے طغیانی کے متعلق استفسار کیا تو اس کی خواہش کے مطابق صحیح صحیح اعداد و شمار بہم پہنچائے گئے۔ تب فرعون نے خواب میں دیوتا خنمو کو یہ کہتے سنا کہ مصر مصائب و آلام میں اس لیے گرفتار کیا گیا ہے کہ دیوتاؤں کے لیے کوئی مندر نہیں بنایا گیا۔ فرعون نے بیدار ہوتے ہی خنمو کے پجاریوں کو زمینیں عطا کیں اور حکم دیا کہ نیل کی پہلی آبشار کے قرب و جوار سے جو شکار اور مچھلیاں پکڑی جایا کریں۔ ان میں سے ایک مقررہ حصہ خنمو کے پجاریوں کو دیا جایا کرے۔

میں نے بہت کچھ جمع کیا تھا۔ عظیم الشان تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرا دل حلیم تھا اور ہر کبیدگی سے آزاد۔ دیوتاؤں نے مجھے خوش بختی سے نوازا تھا۔ شہر والے میری صحت مند اور پُر مسرت زندگی کے خواہاں تھے۔۔۔ میں بد کرداروں کو کیفر کردار کو پہنچاتا تھا۔۔۔

ان دنوں شہر میں جو بچے میرے سامنے کھڑے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے ملا کر ساٹھ ہوتے تھے۔ ان کے لیئے اتنے ہی بستر، کرسیاں اور میزیں مہیا کی گئیں۔ انھوں نے سب ملا کر ۱۲۰ - 'اِفا' (مصری پیمانہ) باجرہ، تین گایوں کا دودھ، پچاس بکریاں اور ۹ گدھیاں، روغن کا ایک 'حن' (مصری پیمانہ) اور تیل کے دو مرتبان خرچ کیئے۔ کچھ حاسدوں کو میری باتیں مذاق ہی معلوم ہوں گی۔ لیکن دیوتا منتھ کو اپنی سچائی کا گواہ بناتا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے اپنے گھر ہی میں تیار کرایا تھا۔۔۔

تخم ریزی کے وقت میں نے بڑی احتیاط اور نگرانی کی اور اب جب کئی سالوں کا قحط شروع ہوا تو میں نے بھوک کے شہریوں کو اناج مہیا کیا۔" بروعش اوّل ۶۳-۲۶۲

علامہ ندوی نے ابن ہشام کے حوالے سے، ایک قدیم کتبہ لکھا ہے۔ اس کتبہ کو فارسٹر نے بھی اپنے 'جغرافیہ' کے صفحہ ۱۰۳ پر نقل کیا ہے:

"ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یمن میں ایک دفعہ سیلاب سے قبر کھل گئی تو ایک عورت کی لاش نکلی جس کے گلے میں موتیوں کے سات ہار اور انگلیوں میں مرصع انگوٹھیاں تھیں اس کے سر پر ایک لوح تھی جس پر یہ کتبہ لکھا ہُوا تھا:

"تیرے نام پر جو حمیر کا خدا ہے میں ذو شفر کی بیٹی تاجہ ہوں میں نے اپنے قاصد کو یوسفؑ کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے جب دیر لگائی تو میں نے چاندی، پھر سونا بھیجا کہ آدھ سیر آٹا لے آئے لیکن کچھ حاصل نہ ہُوا۔ پھر میں نے حکم دیا کہ میرے جواہرات پیس کر آٹا بنایا جائے، لیکن وہ بیکار تھا ــ جو شخص میرا حال سنے اس کو میرے حال پر رحم کرنا چاہیئے جو عورت میرے زیور پہنے گی وہ میری ہی موت مرے گی۔"

ارض القرآن اوّل ۳۴-۳۵

دراصل یہ خشک سالی اور طبیعاتی ناموافقت دُنیا کے کئی خطوں مثلاً مصر کنعان، شام اور عرب وغیرہ کو لپیٹ میں لے چکی تھی جس کی وجہ سے لوگ وسیع پیمانے پر نقل وحرکت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بہرحال حضرت یوسفؑ کا قحط ایک تاریخی حقیقت ہے اور مصر سے اس کے متعلق زیادہ کتبے اس لئے نہیں مل سکے کہ مصریوں نے ہائیکسوس اور حضرت یوسفؑ کی یادگاروں کو بڑی بے دردی سے نیست و نابود کر دیا تھا کیوں کہ حضرت یوسفؑ اپنی تمام عظمتوں اور شفقتوں کے باوجود تھے تو ان کی نظر میں غیر ملکی اور مصری تو ان سے اس لئے بھی پرخاش رکھتے تھے کہ انھوں نے اناج کے عوض ان کی تمام زمینیں بحق سرکار ضبط کر کے قومی

ملکیت بنا دیا تھا۔ پھر بھلا بڑے لوگ حضرت یوسفؑ کا نام اور ان کی یادگاریں کیسے بچ جانے دیتے۔

نظامِ حکومت

حضرت یوسفؑ اپنے نظامِ حکومت کے سبب قدیم تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وزارت کا عہدہ سنبھالتے ہی آپ نے ایک بیدار مغز اور فرض شناس مدبّر ثابت کر کے اپنے کو اس نازک ذمّہ داری کا پوری طرح اہل ثابت کر دکھایا۔ بقول میکنزی:

"مصریوں نے ہائیکسوس کے طریقہ حکومت سے بہت کچھ سیکھا ہی تھا حضرت یوسفؑ کے ملکی نظام کے ٹھوس اور کفائت شعارانہ اصولوں اور نظم و نسق سے بھی مقامی مصریوں کی انتظامی مشینری بہت کچھ متاثر رہی ہے۔

نوعمر اور زیرک وزیر (یوسفؑ) نے مصر کی حقیقی ضروریات کا صحیح اندازہ اپنی دُور بینی سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شبہ نہیں کہ معمّر اور تجربہ کار اراکینِ دربار نے آپؑ کی بہت کچھ امداد کی لیکن اگر ان کو ذاتی فہم و فراست اور مضبوط اخلاقی قوّت ودیعت نہ کی گئی ہوتی تو ایسی مشکل اور کٹھن ذمّہ داریوں سے اتنی نمایاں کارناموں کے ساتھ عہدہ برآنہ ہو سکتے۔ خوش حالی کے دنوں میں اُنھوں نے ملک کی زراعت کو خُوب خُوب ترقّی دی اور اس طرح بے پناہ اناج جمع کر لیا۔"

آپ نے جس طرح قحط کی خوفناک صورت حال کو پوری طرح تھامے رکھا وہ آپؑ کا فقید المثال کارنامہ ہے۔ متعدد علاقوں کا دورہ کر کے آپؑ نے حالات کا جائزہ

لیا اور قحط کے آثار دیکھ کر پیش بینی کے طور پر انھوں نے ہر شہر میں غلہ کا ذخیرہ کرانا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے اناج گودام بنائے گئے۔ ابتداء میں تو اس غلہ کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا لیکن بعد میں اناج اتنا جمع ہو گیا کہ حساب کتاب رکھنا قریباً ناممکن ہو گیا۔ تاہم ان ذخائر کی جانچ پڑتال اور نگرانی کے لئے بہت کافی تعداد میں کلرک، ناظم اور دیگر عملہ بھرتی کیا گیا۔

جب قحط نے خوفناک صورت اختیار کر گیا تو مصر کے کونے کونے اور ممالک غیر سے فاقہ مست غلہ کے حصول کے لئے سرکاری اناج گوداموں کی طرف چل پڑے۔ اس طرح قحط کے دنوں میں حضرت یوسفؑ نے نہ صرف مصریوں کو ہی ضرورت کے مطابق غلہ فراہم کیا بلکہ غیر ملکیوں کا بھی پیٹ بھرا۔

نظامِ جاگیرداری کا خاتمہ

آپؑ کا سب سے بڑا کارنامہ دراصل یہ تھا کہ مصر کے مستبد و مضبوط جاگیرداری نظام کو پاش پاش کر کے رکھ دیا اور اس طرح آپؑ دنیا کی غالباً پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے جاگیرداری اور انفرادی ملکیت کو ختم کر کے سٹیٹ کی تحویل میں لے لیا۔ اس نظام کی جملہ خرابیوں سے آپؑ بخوبی آگاہ تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک بڑی بڑی زمینداریوں کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔ اس وقت تک نہ تو جاگیرداروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے غریب عوام کی حالت سدھر سکتی ہے اور نہ ہی مرکز مضبوط ہو سکتا ہے اس لئے قدرتاً وہ تمام املاک سٹیٹ کی تحویل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کی یہ خواہش صرف تمنا یا نظریے تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ عملاً انھوں نے قریباً تمام لگان

حقوق ختم کر کے رکھ دے۔

اناج کو آپؑ پہلے سرکاری تحویل میں لے چکے تھے اور جب قحط پڑا تو لوگ نقدی لے لے کر سرکاری اناج گوداموں کی طرف چل پڑے۔ ہر شہر میں گوداموں کے سرکاری عمّال حسب حکم متوقع صورتِ حال کے لئے پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ آپؑ نے پہلے یہ کیا کہ لوگوں سے وہ چیزیں لے لیں جن کے ہوتے وہ گورنمنٹ کو اراضی کسی صورت دینے کو تیار نہ ہو سکتے تھے یعنی نقدی، مویشی اور دیگر اثاثہ۔ بالآخر لوگ زرعی زمینیں تک دینے کو مجبور ہو گئے اور آخر وہ وقت آ گیا کہ قریباً سب زرعی زمینیں مشترکہ طور پر قوم کی تحویل میں آ گئیں۔ مرکز مضبوط ہو گیا اور مصر کا جاگیرداری نظام بُری طرح مفلوج ہو کر رہ گیا۔

قحط جب ختم ہوا تو اب حضرت یوسفؑ کے سامنے جو سب سے اہم مسئلہ تھا وہ تھا کاشت کی از سرِ نو بحالی کا — اس کے بغیر عوام کا معیارِ زندگی ہی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ مصر مکمل زرعی ملک تھا۔ اس لئے آپؑ نے یہ اقدام کیا کہ اب معمولی سے معمولی کسان کو بھی زمین دے کے زمیندار کے پنجۂ استبداد سے گلو خلاصی کرا دی اور بیج لوگوں میں مفت تقسیم کیا لیکن شرط یہ رکھی کہ کل پیداوار کا پانچواں حصہ بطور لگان، کاشتکار حکومت کو ادا کرے گا اور باقی اس کی اپنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح لوگوں نے پیداوار کو بڑھانے کی خاطر خوب کوشش و محنت کی ہوگی۔

اپنی وزارت کے غالباً بالکل ابتدائی ایام میں حضرت یوسفؑ نے اون (ہیلیوپولس)

کے پجاری فوطیفرع کی دختر اسناتؔ سے شادی کر لی۔ مصری پجاری کا ایک ایشیائی نژاد عبرانی کو اپنی لڑکی دے دینا ہے واقعی ذرا تعجب انگیز۔ کیوں کہ یہ مصری پجاری پرلے درجے کے سرکش اور متعصب ہوا کرتے تھے۔ اسناتؔ اور فوطیفرعؔ خالص مصری نام ہیں فوطیفرع کا مصری تلفظ ہے پیتی فرع یعنی "عطیۂ آفتاب" (سُورج کا تحفہ)

اسناتؔ کے بطن سے آپؑ کے دو لڑکے منسّی اور افرائیم پیدا ہوئے آپ نے ایک سو دس برس کی عمر پائی اور آپؑ کے جسم کو حنوط کر کے تابوت میں رکھا گیا۔ آپؑ وصیت کر گئے تھے کہ میری نعش مصر سے لے جائی جائے۔

"اور موسیٰ یوسف کی ہڈیوں کو ساتھ لیتا گیا کیونکہ اس نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ کر کہ خدا ضرور تمھاری خبر لے گا، اس بات کی سخت قسم لے لی تھی کہ تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لیتے جانا۔" خروج ۱۳/۱۹

اس سے پہلے حضرت یعقوبؑ کی خواہش کے مطابق خود حضرت یوسفؑ نے اپنے والدِ مکرم کو لے جا کر اسی مکفیلہ والے غار میں دفن کیا تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ، سارہؑ، اسحٰقؑ، اور ربقہ زوجہ اسحٰقؑ اور لیاہ زوجہ یعقوبؑ دفن تھیں۔

حتشپسط

"تاریخ کی سب سے پہلی ملکہ"

وہ عظیم عورت جس نے بائیس برس تک دُنیا
کے اس اوّلین فاتح کو پوری طرح اپنی مٹھی
میں رکھا جو مصر کا سب سے بڑا ڈپلومیٹ
اور تاریخ کے چند عظیم ترین فرمانرواؤں
میں سے ہے۔

حُطِشی پُشِط

فراعنۂ مصر کا اٹھارھواں خاندان ۱۵۸۷/۱۳۲۸ ق۔م تاریخ کے چند نامور ترین خاندانوں میں سے ایک ہے۔ یہی وہ اڑھائی سو سال تھے جب مصر دُنیا کا سب سے زیادہ خوشحال، مہذب اور طاقتور ملک بن گیا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب مصری جُملہ علوم و فنون کو اوجِ کمال تک لے گئے۔ ہائیکسوس کی غلامی سے ملک کو نجات دلانے والا آحمس، تاریخ کی سب سے پہلی مطلق العنان ملکہ حُطِشی پُشِط اور دُنیا کا اوّلین بین الاقوامی فاتح تُوتمس سوم اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ایک سو دو شیروں کا شکار کرنے والے سب سے پُرشکوہ اور شاندار فرعون آمنحوطپ سوم، تاریخِ انسانی کے پہلے موحد فلسفی، مفکر، شاعر، سائنس دان اور انٹرنیشنلزم کے اوّلیں علمبردار اخناتون اور حسین ترین فرعون توت آنخ آمن کو پیدا کرنے کا شرف بھی اسی خاندان کو حاصل ہے۔

ابتدائی حالات

اسی اٹھارھویں خاندان کے تیسرے جنگجو فرعون تُوتمس اوّل کی ملکہ اُحموسی کے بطن سے چار بچے پیدا ہوئے۔ دو لڑکے اُمنمس اور یوآت حمس اور دو لڑکیاں نفرو خبت اور حُطِشی پسیط۔ حطشی اس وقت پیدا ہوئی جب اس کی ماں پچیس برس کی تھی۔

اس کے تینوں بہن بھائی نوعمری میں ہی چل بسے۔ چنانچہ مصری قانونِ تخت نشینی
کی رُو سے اب یہی تخت کی جائز حق دار رہ گئی تھی۔ توتمس اوّل کی ایک دوسری
بیگم مُت نُفرت سے ایک اور لڑکا تھا جو آگے چل کر توتمس دوم کے نام سے
بادشاہ بنا۔ محققین توتمس اوّل کی بارے میں شدید اختلافِ نظر رکھتے ہیں۔
اوّلین ماہرینِ مصریات مثلاً برُگ ہنکز
لیپسس اور وغیرہ کے ساتھ
ساتھ دورِ جدید کے نامور عالم بریسٹڈ کے خیال میں
بھی حتشپسوت، توتمس دوم اور اس خاندان کا چھٹا فرعون توتمس سوم تینوں سوتیلے
بھائی بہن تھے۔ ان علمار کے نظریہ کا لب لباب یہ ہے:

"توتمس دوم مُت نُفرت سے اور توتمس سوم — توتمس اوّل کی
ایک اور ملکہ اَسِت کے بطن سے تھا۔ ملکہ اَہموسی کے انتقال کے
بعد بعض اراکین حکومت کے دباؤ میں آن کر توتمس اوّل کو تخت سے
دستبردار ہو جانا پڑا۔ اور حتشپسوت نے اَسِت کے بیٹے توتمس سے
شادی کر لی۔ یہی لڑکا بعد میں توتمس سوم کے نام سے مشہور ہوا۔
بعض وجوہات کی بنا پر اس نے حتشپسوت کو حکومت سے قطعاً بے دخل
کر دیا اور وہ پس منظر میں چلی گئی۔ لیکن ایک طاقتور طبقہ شاہزادی
کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس لئے توتمس اسے دوبارہ شریکِ حکومت
کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ دونوں پانچ برس ہی حکومت کر پائے تھے

کو مُتّ تغرتّ نزادہ، تو تمس دوم قوت پکڑ گیا، اور ان دونوں کو پرے ہٹا دیا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ حتشپسٹ کے حمایتی اماکین دربار اور تو تمس دوم کے حلیف پجاری باہمی طویل کش مکش کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے۔

بہر حال تو تمس دوم نے اپنے بوڑھے اور معزول شدہ باپ تو تمس اول کو ساتھ ملا کر حکومت شروع کی اور باپ کی موت کے بعد بیٹا تنہا برسرِ اقتدار رہا۔ جب وہ مرا تو حتشپسٹ کے ساتھ مل کر تو تمس سوم نے حکومت کی اور یہ بھی مر گئی تو حکومت کا وہ واحد مالک تھا۔"

لیکن اس غیر معمولی نظریئے کی تائید میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں وہ بہت ہی بودے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ تو تمس سوم دراصل تو تمس دوم کا بیٹا اور اس کی دوسری بیوی است کے بطن سے تھا۔ حتشپسٹ سے اس کی شادی کی غلط فہمی ان لوگوں کو اس لئے پیدا ہوئی کہ ملکہ حتشپسٹ کی چھوٹی بیٹی حتشپسٹ مرے تو تمس سوم سے بیاہی گئی تھی، جو ماں کی قریباً ہم نام تھی لیکن دونوں کے ناموں میں معنوی فرق ہے۔ حتشپسٹ کے معنی ہیں 'معزز خواتین کی سربراہ' — اور حتشپسٹ مرے کا مطلب ہے 'معزز خاتون' — پھر یہ کہ اگر بریسٹڈ وغیرہ کے نظریئے کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو تمس سوم نے بہت لمبی (نوے سال سے زیادہ) عمر پائی۔ لیکن اس کی ممی سے اس کی تائید نہیں ہو رہی اور ہال ( ) کے خیال میں تو حتشپسٹ نے بیمار تو تمس دوم سے شادی ہی نہیں کی بلکہ اس کی موت کے بعد اپنے نوخیز بھتیجے تو تمس سوم کے

حوز میں آگئی۔

بیٹی باپ کی بے حد لاڈلی تھی اور وہ شفیق باپ کی زندگی میں ہی امورِ سلطنت میں ماہر ہو گئی تھی۔ توتمس اوّل نے اپنی صحت کو گرتا دیکھ کر حکومت کے آخری پانچ چھ مہینوں میں لائق و زیرک حطشی کو شریکِ حکومت کر لیا۔ اب یہاں پھر دو نظریے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ توتمس اوّل اپنے نااہل بیٹے توتمس دوم سے کبیدہ خاطر تھا۔ چنانچہ چاہتا تھا کہ حطشی باپ کی جگہ لے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود ہی ان دو سوتیلے بہن بھائیوں کا نکاح کر گیا تھا تاکہ توتمس دوم کا حق تخت پر قائم ہو جائے اور وہ فرعون بن سکے اور یہی زیادہ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حطشی اپنی طبعی نفرت کی بنا پر اس سے کبھی بھی شادی نہ کر سکتی اور وہ فرعون نہ بن سکتا۔ اس لیے کہ اس کی ماں تُمت نفرت نسلِ شاہی سے نہ تھی اور حطشی کے ہوتے اسے کوئی نہ پوچھتا۔ کیونکہ حطشی کی ماں اہموتسی شاہی خاندان سے تھی۔ چنانچہ سوتیلے بھائی کی نسبت حطشی کا حق تخت پر زیادہ تھا۔

لے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم قدیم مصری قانونِ تخت نشینی کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیں کہ آخر مصریوں کے ہاں یہ بہن بھائی کا رشتہ کیوں ہو جاتا تھا جو آج ہمیں قطعاً غیر مانوس اور عجیب سا نظر آتا ہے۔ بات اصل میں یوں ہے کہ ان کے خیال میں فرعون براہِ راست سورج کی نسل سے ہوتا تھا (یہی عقیدہ ہمیں بعد کے ہندوستان میں مل رہا ہے جہاں افسانوی کردار رام چندر جی اور ان کے خاندان کو (بقیہ بر صفحہ ۱۵۳)

(بقیہ حاشیہ صد ۱۵۲) "سورج بنسی" سمجھا جاتا ہے) — اب جو شخص "سورج کے صلب" سے نہیں ہوتا تھا اسے مصری تخت پر کوئی حق نہ تھا اور شمسی نسب سے وہ خیال کیا جاتا تھا جس کے ماں باپ، ہر دو خالصۃً شاہی خاندان سے ہوں۔ غرض شہزادے کی شرافت و نجابت اور تخت پر جائز دعوے کا معیار یہ تھا کہ آیا وہ اپنی رگوں میں "آفتابی خون" رکھتا ہے یا نہیں؟ — اور اگر وہ اس معیار پر پورا نہ اترتا تو پھر اس پر "اصل شاہزادی" کو ترجیح دی جاتی۔ لہٰذا اس خامی کو دور کرنے کی خاطر کم رتبہ شاہزادہ اپنی اس برتر بہن سے شادی کر لیتا تھا۔ مصریوں کے اس جوڑے کی شادی بہترین سمجھی جاتی تھی جس کے ماں باپ بھی بھائی بہن رہ چکے ہوں۔ ان کے نزدیک خالص خون برقرار رکھنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا کہ فرعون کی بیوی کوئی شاہزادی نہ ہوتی۔ ایسی صورت میں معبودِ اعظم "آمن را" سے التجا کی جاتی کہ وہ ملکہ کے پاس جائے۔ اس پر "آمن را" زمین پر نزول کرتا اور خاوند کی شکل میں ملکہ کے پاس جاتا۔ اس طرح جو اولاد پیدا ہوتی وہ صحیح النسب اور خاص نسلِ شاہی سے متصور ہوتی تھی۔ (یاد رہے کہ یہ سب کچھ فرضی ہوتا تھا حقیقتاً اس میں کچھ نہ تھی) اور ایسا بھی ہوتا کہ فرعون اپنی نسبی خامی کو دور کرنے کی خاطر اپنے آپ کو "آمن را" کی نسل سے مشہور کر دیتا تھا۔ ہر نئے خاندان کا بانی اپنا حق تخت پر ثابت کرنے کے لئے اپنے (بقیہ حاشیہ ۱۵۴)

"توث" کے مہینے کی پہلی تاریخ کو بیٹی کی پہلی تاجپوشی ہوئی۔ حطشی اس وقت پندرہ برس کی تھی اور اس کا شوہر اکیس سال کا ہو چکا تھا۔ اکیس سال تک ان دونوں میاں بیوی نے مل کر حکومت کی لیکن نا اہل شوہر کی حیثیت محض ایک نمائشی اور کٹھ پتلی کی تھی۔ زیرک ملکہ نے اسے کبھی بھی سیاسی اہمیت یا عوام سے رابطہ نہ رکھنے دیا۔ احکام وہ جاری کرتی شکایات و مقدمات کی وہ سماعت وہ کرتی۔ فیصلے اسی کے نافذ ہوتے غرض سلطنت کے تمام کام وہ انجام دیتی تھی۔

حطشی کو دراصل وقت کی اہم اور مقتدر ہستیوں کی پوری پوری حمایت حاصل تھی۔ ان میں سنمت سب سے نمایاں ہے وہ ملکہ کا امیر عمارت بھی تھا اور جاگیر شاہی کا نگراں اعلیٰ بھی۔ شاہی مہر اسی کے پاس رہتی تھی۔ وہ ملکہ کی بڑی بیٹی نوفررا کا اتالیق بھی تھا۔ بوس اور حتوفر کا بیٹا یہ سنمت نسبی لحاظ سے تو کچھ اونچا نہ تھا مگر اپنی وفاداری اور تدبر کے باعث ملکہ کا مشیر خاص اور محبوب بن چکا تھا۔ اسوان کے مقام پر ایک جگہ سنمت لکھتا ہے:

"میں ایک آدمی ہوں۔ ملکہ کا انتہائی قرب مجھے حاصل ہے اور اس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۳) پیش رو خاندان سے کوئی غرضی رشتہ جوڑ لیتا یا پھر سابقہ خاندان کی شاہزادی سے شادی کر لیتا تھا۔ تخت نشینی کے اس قانون کی بدولت مصری تاریخ میں نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے۔ جانشینی کے سلسلے میں بہت سی آئینی اور رجائز اور اس کے ساتھ ہی بعض جعلی وصیتیں بھی بے اثر ہو کر رہ گئیں۔

ہمدردیاں اور نوازشات جیت چکا ہوں۔ اس نے مجھے ملک کی اہم ترین
شخصیت اور ملک کا نگران بنا دیا ہے۔ اپنے آقا (ملکہ) کے زیر سایہ
زندہ ہوں ۔ خدا اسے تا ابد سلامت رکھے۔"

سینمت کے علاوہ اس کا بھائی سنن، امیر البحر نحیسی، توتمس اول کے میر عمارت
انینی کا بیٹا منخ، ملکہ کا وزیر اور آمن دیوتا کا پجاری حپوسب اور وزیر خزانہ تُوتی
جیسے با اثر شخص بھی حطشپی کی پشت پناہی کر رہے تھے لیکن ملکہ سے اس
وفاداری کی قیمت ان کو بہت مہنگی ادا کرنا پڑی۔ حطشپی کے جانشین توتمس سوم
نے ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا اور ان کی تقریباً ہر یادگار کو بُری طرح
مسخ کرا دیا۔

میاں بیوی کی کبھی نہ بنی اور اولوالعزم بیوی نالائق اور دائم المریض شوہر سے
کبھی خوش نہ رہ سکی۔ ملکہ کے اپنے شوہر سے شدید تنفر کا پتہ کئی باتوں سے
چلتا ہے۔ ایک تو اس سے کہ شوہر کے مرتے ہی اس نے ہر مشترکہ یادگار
سے اس کا نام مسخ کرا کے اپنے باپ کا نام کندہ کرا دیا۔ ان کے تعلقات
کی کشیدگی کی شہادت اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ملکہ کے بطن سے توتمس دوم
کی دو لڑکیاں پیدا ہوئیں ایک نوفرورا (یعنی سورج دیوتا، را کی خوبصورتیاں) اور
دوسری حطشپ سط۔ ان دونوں بہنوں کی عمر میں پندرہ سال سے بھی کچھ زیادہ کا ہی
فرق تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس درمیانی عرصے میں میاں بیوی کے
تعلقات اس قدر کشیدہ رہے کہ معمول کے مطابق ازدواجی تعلقات بھی قائم نہ

رہ سکے اور توتمس کی زندگی کے آخری چند سالوں میں مصالحت ہوئی اور وہ بھی عارضی — یہ بھی اس لئے کہ حطشپ، توتمس سے بیٹا لینا چاہتی تھی تاکہ ملکہ کے بعد تخت توتمس دوم کی دوسری بیوی است کے بیٹے توتمس سوم کے قبضے میں نہ چلا جائے جس کی جانب اب باپ زیادہ مائل نظر آنے لگا تھا حسین و ذہین بڑی شاہزادی نفرزا موجود تھی لیکن دربار کا ایک طاقتور فریق باپ بیٹے کی حمایت پر تھا۔

۱۹ سال کی برائے نام حکومت کے بعد نحیف و نزار چالیس سالہ توتمس دوم مر گیا۔ الیٹ سمتھ (Eliot Smith) کی رائے میں اس کی موت کا سبب کوئی خاص زہریلی بیماری تھی لیکن ویگل (Weigall) کے خیال میں اس کی موت زہر خورانی کے باعث ہوئی۔ اب پینتیس سالہ ملکہ گو تنہا رہ گئی تھی لیکن اس کے مقابلے میں تخت کا دوسرا دعوے دار اس کا نو سالہ بھتیجا توتمس بھی تھا۔ اسے باپ موت سے چند ہی ہفتے قبل اپنے حمایتی امرار کی شہ پر جانشین مقرر کر گیا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد وقتی طور پر سیاسی حالات میں کچھ انتشار سا ہو گیا۔ کیونکہ توتمس سوم کی حامی پارٹی، کمسن شہزادے کی آڑ لے کر حطشپ کے پشت پناہوں کے مقابل اقتدار میں حصہ بٹانا چاہتی تھی۔ لیکن اولوالعزم ملکہ نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور مرحوم باپ کی طرح بیٹا بھی عضوِ معطل ہو کر رہ گیا۔ اور اسے ملکہ کی موت یعنی تیس سال کی عمر تک غالباً مندر کے کاہن کی حیثیت سے عمر گزارنا پڑی۔ اس کے باوجود نیکدل ملکہ نے اس پر اپنی شفقتوں اور عنایات کی
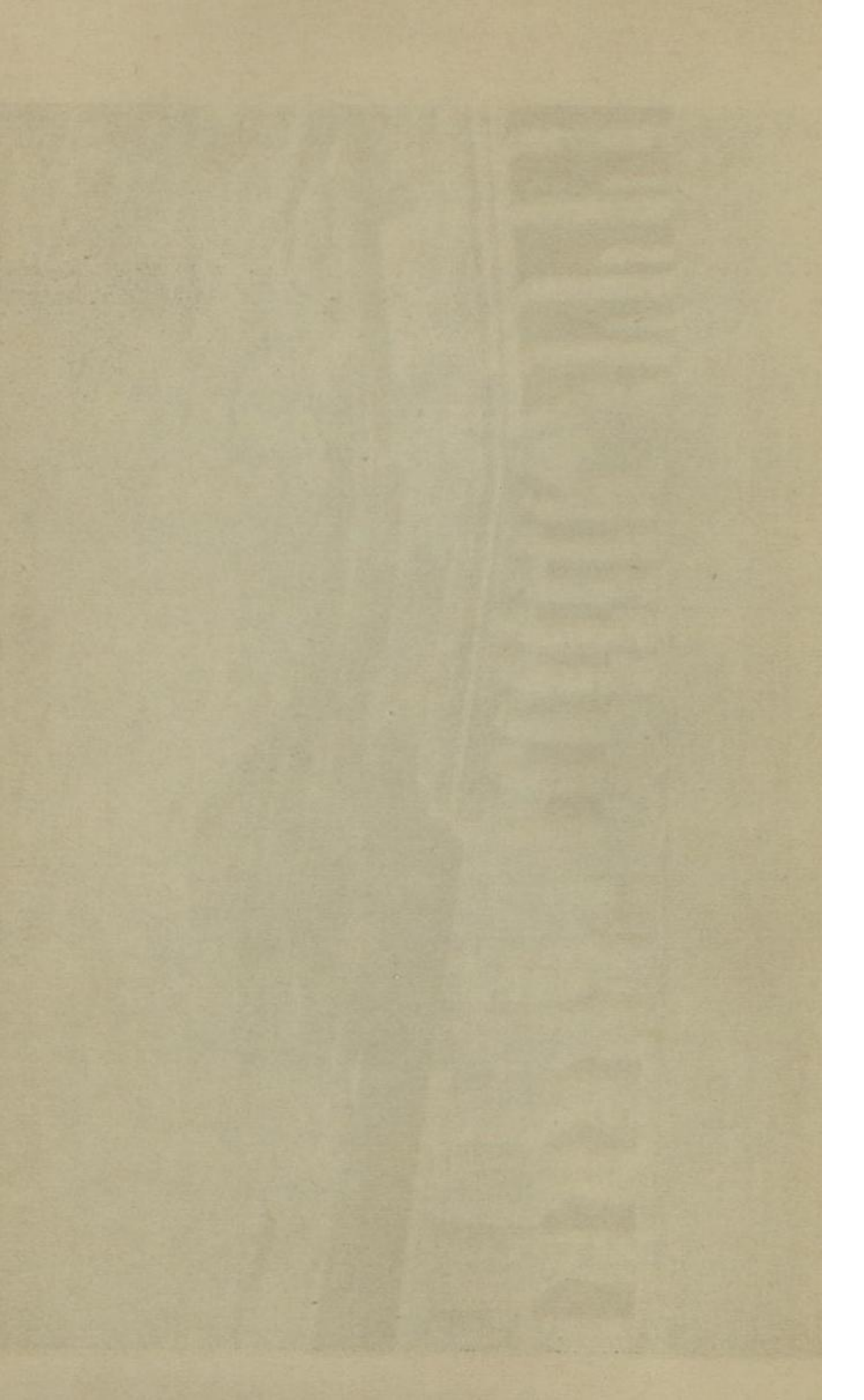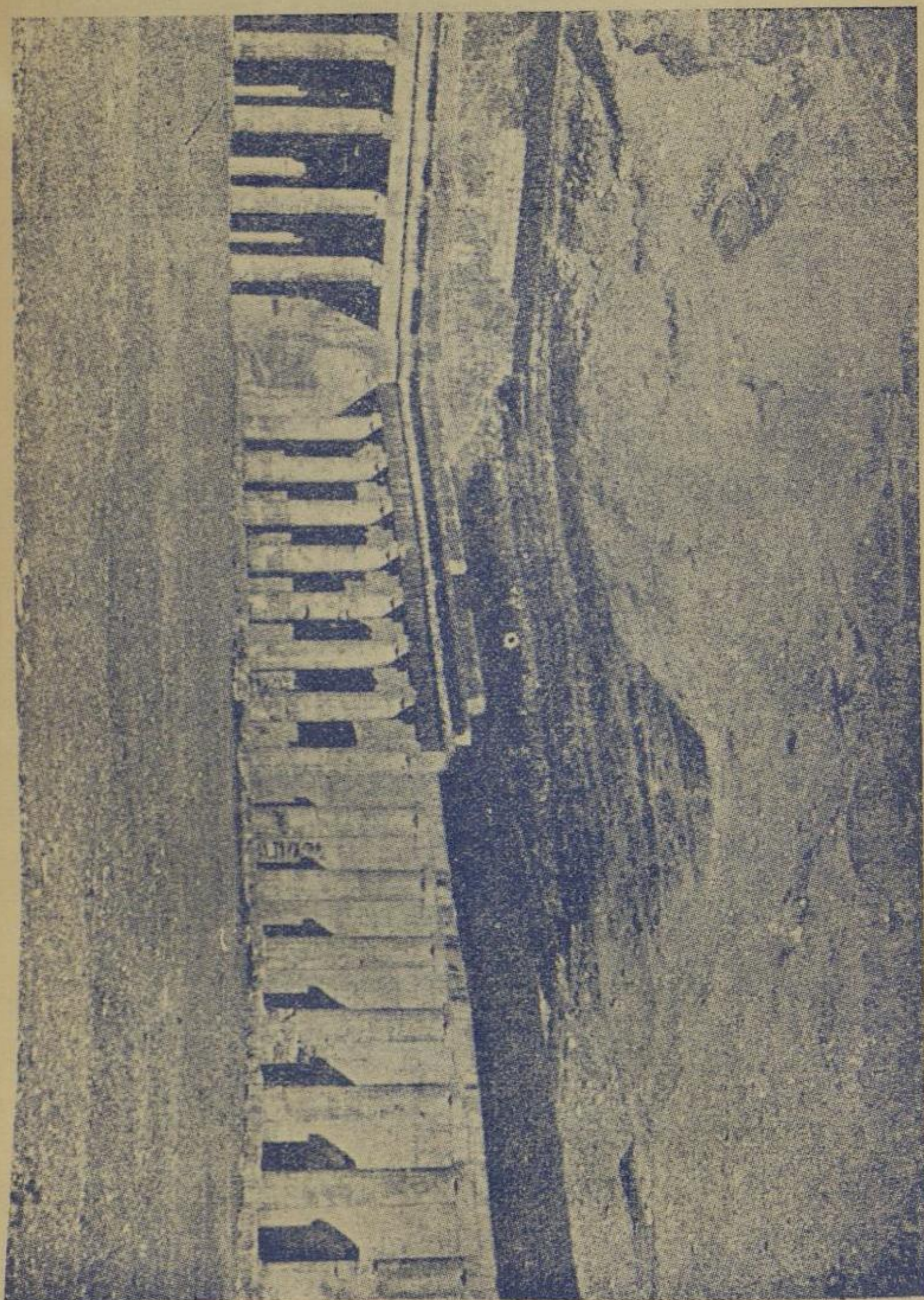
دیر البحری کا مندر

بارش برابر جاری رکھی اور اپنی خوبرو اور ہونہار بیٹی نوفرزا کی موت کے بعد اس نے توتمس کو اپنی چھوٹی بیٹی حطشپ سُط سے بیاہ دیا تاکہ اس کا حق تخت پر مستحکم ہو جائے۔

تاہم توتمس کی موت کے بعد حطشی کو بھتیجے کی پارٹی کا زور توڑنے اور رعایا کو مکمل طور پر اپنے حق میں جیت لینے کے لئے مسلسل پراپیگنڈہ کرنا پڑا اور اس مقصد کی خاطر اس نے دو اہم اقدامات کئے۔ ایک تو یہ کہ اس نے مشہور کر دیا کہ اس کا باپ توتمس اول اسے جانشین بنانا چاہتا تھا۔ دیر البحری کے مندر میں ایک جگہ لکھتی ہے کہ توتمس اول نے ایک مرتبہ بھرے دربار میں اسے اپنے ساتھ بٹھا کر اعلان کیا،

"یہ ہے میری بیٹی آمنیئس حطشی سُپط — یہی ہے جو میرے درخشاں تخت پہ جلوہ افروز ہوگی۔ تمہاری راہنمائی کرے گی۔ رعایا کے لئے احکام صادر کرے گی۔ اس کے حکم کی بجا آوری تمہارا فرض ہوگا۔ اس کی اطاعت و تعظیم کرنے والا زندہ اور نافرمان و گستاخ لقمۂ اجل ہو جائے گا۔"

ملکہ کی پیدائش کا دلچسپ افسانہ

دوسرا قدم اس سلسلے میں حطشی نے یہ اُٹھایا کہ اس نے اپنے آپ کو معبودِ اعظم آمن را کی نسل سے بتلایا — ملکہ نے یہ رومان انگیز کہانی بڑے ہی دلچسپ انداز میں اپنے مشہور و معروف مندر واقع دیر البحری میں مصوّر و منقوش کرا دی۔ پہلے منظر میں دیوتاؤں کی سرزمین میں آمن را کی

زیرِ صدارت دیوتاؤں کا ایک جلسہ دکھایا گیا ہے۔ آمن کے دائیں طرف آمن، وزیر آتمس، مفتیس، محبت کی دیوی ہاتور، حورس اور انوبیس تھے اور بائیں طرف جنگ کا دیوتا منتو، زمین کا دیوتا حب، آسمان کی دیوی نُت، اُتو، شو اور دیوی تفنوت تھے ۔۔ اور دیوتاؤں سے آمن را یوں مخاطب ہوا:

"میں ایک عظیم ملکہ بناؤں گا، جو مصر، شام، نوبیا اور پنٹ پہ حکمرانی کرے گی"۔

اسی موقعہ پر توت دیوتا داخل ہوا، وہ توت جس کی شکل لق لق کی سی ہے تاکہ تیر سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پرواز کر سکے، اس نے خاموشی سے آمن را کی باتیں سنیں اور پھر بولا:

"اے ۔۔ آمن را ۔۔ مصر میں ایک بے مثل حسین عورت رہتی ہے۔ وہ سورج کی طرح درخشاں ہے۔ یقیناً یہی عورت اس ملکہ کی ماں بننے کے قابل ہے"۔

آمن را نے کہا:

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ ہم اس خوبرو شہزادی کو کہاں تلاش کریں ۔۔ اس کا نام کیا ہے؟"

توت بولا:

"وہ اہموسی ہے اور شاہِ مصر کی بیوی، اس کے محل میں رہتی ہے میں تجھے اس کے پاس لے جاؤں گا ۔۔ تو ملکہ کے شوہر توتمس کی شکل

میں اس کے پاس اس وقت جانا جب وہ کہیں باہر گیا ہو"،
تب توت لق لق کی شکل بنا کر مصر کی جانب اُڑا اور اس کے ساتھ ساتھ
شاہِ مصر کے روپ میں آمن را بھی ہو لیا اور سب دیوی دیوتا بھی۔
ان کے ساتھ دیوی 'نیتھ'، اور بچھوؤں کی دیوی 'سلیک' بھی تھی۔
— یہ سب آہستگی سے خاموش محل میں داخل ہوئے اور توت کی
راہنمائی میں اہموسی کے کمرے میں پہنچے۔
ملکہ ایک شیر نما بستر پر محوِ خواب تھی، انھوں نے اسے دیکھا اور
جان لیا کہ وہ دُنیا کی تمام عورتوں سے بڑھ کر خوبصورت ہے۔ وہ اس
کے بے پناہ حسن سے اتنے مسحور تھے کہ بات تک نہ کر سکے۔ ان کی
تیز خوشبو ہر سُو پھیل گئی۔
وہ اٹھ بیٹھی اور اپنے آفاقی مہمانوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
آمن را اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا —
اُس نے سنہری اور ہیرے جواہرات کے زیورات پہن رکھے تھے۔
ملکہ نے اس کا روشن چہرہ دیکھا اور اس کا دل مسرت سے بھرپور
ہو گیا۔
وہ اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ اس نے اپنی چاہت ملکہ میں سمو دی۔
اور بے ساختہ اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ وہ اس کے جمال سے بہت
محظوظ ہوئی۔ دیوتا کی اُلفت اس کے انگ انگ میں سما گئی اور تمام

جسم اس کی خوشبو سے معطر ہو گیا ۔۔۔

اہموسی بولی :

"تیرا جمال ۔۔۔ تیرا چہرہ کتنا مسحور کن ہے ۔ تُو نے میری عظمت کو اپنی تجلّی سے دو بالا کر دیا ہے ۔ تیری مہک مجھ میں رچ گئی ہے ۔۔"

اور اس کے بعد آمن نے ملکہ کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس کی وہ خواہش لے کر آیا تھا ۔

"اس لڑکی کا نام 'آمنیس حلشی پسط' ہو گا جو میں تمھیں دے چلا ہوں یہ بڑی شان سے حکومت کرے گی ۔ میری روح اس کی ہو گی ۔ میری فیاضی سے یہ سرفراز ہو گی اور میرا تاج اس کی زینت ہو گا تاکہ دونو سرزمینوں (بالائی و زیریں مصر) پر حکومت کرے ۔"

پھر آمن نے مقدس 'کوزہ گر' خنمو دیوتا کو بلایا اور کہا :

"میری بیٹی کو حسن و خوبی کا شاہکار بنا دے ۔"

"ایسا ہی ہو گا ۔ تیری بیٹی دیوتاؤں سے بھی بڑھ کر حسین ہو گی ۔"

وضع حمل کی ساعت آئی تو سب دیوتا جمع ہو گئے اور ان کی دیویاں ملکہ کے گرد جھوم گئیں ۔ بچی پیدا ہوئی ۔ ہاتور نے لے کر اسے آمن کے حضور پیش کیا ۔۔۔ آمن نے اسے برکت دی اور سب دیوتاؤں کو دکھلایا ۔ تب شاہزادی تیزی سے جوان ہونے لگی ۔ وہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور پیاری تھی ۔۔۔ وہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ ہو گئی ۔۔۔ وہ

دیوی آتو' کی طرح شباب سے بھرپور تھی —"

نیک و مہربان ملکہ ویسے ہی رعایا میں کیا کم مقبول تھی کہ ان حکایتوں نے تو اسے عوام کی آنکھوں کا تارا بنا دیا — اور توتمس کے پشت پناہوں کا اگر کچھ اثر تھا بھی تو وہ اب بالکل زائل ہو گیا — اس کے متعدد شاہانہ القاب تھے جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:

(۱) "مقدس محبوبہ"

(۲) گرگسوں اور ناگوں کی ملکہ کی حیثیت سے اس کے یہ لقب تھے۔

(ا) اُسَت تِرُون پتو — یعنی 'برسوں کی بردمندی'

(ب) ہی تاؤ نبو — یعنی 'تمام زمینوں کو تھام کر رکھنے والی'

(۳) 'فرمانروائے شاہین' کی حیثیت سے اس کا لقب تھا:

یو ہیرت کو

(۴) نِطِرَت خیبو — "عروج قدسی"

(۵) سن خیبو — "دلوں کو تقویت دینے والی"

(۶) ماتَ کارا — "سورج دیوتا کی صداقت"

حطشی — شاہجہانِ مصر

قدرت نے اسے تعمیر و ترتیب کا ایک ذوق بدرجہ اتم ودیعت کیا تھا۔ مصر کو اس نے ایسی عمارات سے زینت بخشی کہ ہم بجا طور پر اسے 'شاہجہانِ مصر' کہہ سکتے ہیں۔ اپنی بے پناہ دولت کی وافر مقدار اس نے عمارتوں پر لگا دی۔ صرف اتنی

عمارتیں ہی نہیں بنوائیں بلکہ ان کی بھی مرمت از سرِ نو کرائی جنھیں ہائیکسوس کے دورِ حکومت میں نقصان پہنچ گیا تھا۔ اور جو اس کے بزرگوں کے عہد میں کس مپرسی کے عالم میں پڑی تھیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہے:

"میں نے تباہ شدہ عمارتوں کو پھر سے بنوایا، جو را (دیوتا) کے شہر ہلیوپولس منکر اور "آموٗ" اور "اوراس" کے لوگ ڈھا گئے تھے۔"

اس کی عمارتوں میں سب سے اہم اور خوبصورت دیر البحری کا مندر ہے۔ آٹھ سو فٹ۔ یہ نادرِ روزگار اور حسین مندر اس نے دار الحکومت شیبہ (تھیبس) کے سامنے دریا کے مغربی کنارے، دیر البحری کے مقام پر معبودِ اعظم آمن، ہاتھور (دیوی) اور انوبیس دیوتا کے نام پر بنوایا۔ سیاح آج بھی اس کے طرزِ تعمیر اور دل نشین نقاشی و مصوری کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یونانیوں نے "اکراپولس" میں ایتھنیا کے مندر کی تعمیر کلیتہً ملکہ کے اسی مندر کے نمونے پر کی۔ بنی حسن میں اس نے دیوی "پخت" کے لیے مندر بنوایا۔ ان کے علاوہ چونے اور سنگِ مرمر کا ایک اور مندر تعمیر کرایا، اس کے دروازے پیتل اور الیکٹرم کے تھے۔ سنگِ سرخ کے چار ستون "سنمت" کی زیرِ نگرانی ترشوا کر آمن کے مندر میں لگوائے اور بہت سی عمارتوں کے علاوہ اسوان کے مقام پر دو نہایت خوبصورت اور عظیم الشان ستون ملکہ کے لیے تراش کر تھیبہ میں لا کر نصب کیے گئے۔ یہ ۹۸ اور ۱۰۵ فٹ بلند تھے۔ ان سے اونچے ستون مصر کی تاریخ میں اس وقت تک نہیں بن سکے تھے اور انجینیری کے کمال کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی تعمیر میں صرف سات ماہ لگے۔ ملکہ نے ان کے متعلق

لکھا ہے:

"میں محل میں بیٹھی اپنے پیدا کرنے والے پر غور کر رہی تھی کہ دل نے کہا اُٹھ اور آسمانوں سے باتیں کرنے والے دو مینار اپنے خالق کے لئے بنوا۔ میں نے یہ مینار بنوائے تاکہ میرا نام رہتی دُنیا تک رہے۔ مینار صرف ایک ہی پتھر سے بنے ہیں۔ نہ کہیں ان میں جوڑ ہے اور نہ کہیں دوسرا پتھر لگا ہے۔ میری حکومت کے پندرھویں برس میخر کے مہینے کے پہلے دن کام شروع ہو کر سولھویں برس میسوری کے مہینے کے آخری دن ۔ سات ماہ میں کام ختم ہو گیا۔"

حتشی کی عمارتوں کو توتمس سوم کے ہاتھوں سخت نقصان پہنچا۔

اس کا بحری بیڑہ اور تجارت میں فروغ

وہ صرف پتھروں سے ہی نہیں کھیلی ہے۔ بلکہ اس کی عقابی نگاہیں سمندروں اور ان میں گھری ہوئی دُور افتادہ طلسماتی سرزمین کو بھی چیرتی رہی ہیں۔ خاوند کی موت کے بعد اُس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ اس نے ممالک غیر سے پُرامن تجارتی تعلقات قائم کرنے کا ایک منصوبہ بنایا اور پھر اس نے اسے خوش اسلوبی کے ساتھ پُورا بھی کیا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے سب سے پہلے بحیرۂ قلزم کے جنوبی ساحلوں پر کچھ بندرگاہیں تعمیر کرا کے جہازی بیڑے بنانے کے احکام صادر کئے۔ یہ جہاز بادبانوں سے بھی چلتے تھے اور چپوؤں سے بھی۔ تیس بڑے جہاز تو ایسے تھے جو کھلے سمندر سے

راستہ صاف کرتے ہوئے تجارتی جہازوں کو بندرگاہ تک بحفاظت تمام پہنچاتے تھے۔ دس بارہ امدادی جہاز ملاحوں کے لئے مخصوص تھے۔ کچھ جہازوں پر مسلح آدمی ہوتے کہ اگر کسی جگہ کے باشندے پُرامن تاجرانہ تعلقات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آمادۂ شر ہو ہی جائیں تو مقابلہ کیا جاسکے۔۔ ان سب تیاریوں کے بعد اُس نے متعدد ملکوں کو دوستانہ تجارتی وفود بھیجے۔

سب سے اہم اور بڑی تجارتی مہم سرزمین 'پنٹ' وہاں کے باشندوں کے لئے قیمتی اور کثیر تحائف دے کر روانہ کی اور یہی ملکہ کا سب سے بڑا کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ حطشپ سے پہلے بارھویں خاندان کے زمانے تک تو اہل مصر 'پنٹ' سے تجارت ضرور کرتے رہے تھے لیکن ہائیکسوس کے زمانے میں مصر کے بیرونی راستے اور ذرائع رسل و رسائل بُری طرح متاثر ہوئے تھے اور اکثر بیرونی راستے معدوم ہو چکے تھے۔۔۔ چنانچہ 'پنٹ' سے بھی ان کی آمد و رفت منقطع ہو چکی تھی اور یہ سرزمین اب مصریوں کے لئے خوابوں اور افسانوں کی ایک نامعلوم پُراسرار زمین بن چکی تھی۔ اس کی شادابی اور تموّل کے افسانے مصریوں میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ نیز قدیم مصری اپنی تہذیب کا سرچشمہ بھی 'ارضِ پنٹ' کو ہی قرار دیتے تھے اور ایک روز ملکہ آمن کے مندر میں کھڑی تھی کہ ندا آئی "پنٹ کو دوبارہ دریافت کیا جائے۔"

'پنٹ' کو عام طور پر جنوبی عرب گردانا گیا ہے اور یہ خیال اس لئے قائم کیا گیا کہ مصریوں کا بڑا مقصد مصالحے، لوبان، عنبر، عود اور دیگر خوشبویات

حاصل کرنا تھا، جو ازمنۂ قدیم عرب میں بہ کثرت پیدا ہوتی تھیں لیکن 'پنٹ' سے ملکہ کا تجارتی وفد جو دوسری اشیا بھی لے کر لوٹا، بظاہر عرب میں ان کے ہونے کا کوئی امکان تو ہے نہیں۔ 'پنٹ' یا کم ازکم وہ 'پنٹ' جس کا تعلق اس مہم سے ہے جزیرہ نمائے عرب یا اس کا کوئی حصہ نہ تھا بلکہ ہم اس خیال سے متفق ہیں کہ یہ افریقہ کا وہ خطہ تھا جسے آج کل 'صومالی لینڈ' کہا جاتا ہے۔

پنٹ کی تجارتی مہم کی تنظیم اور روانگی کے جملہ انتظامات ملکہ نے افسر خزانہ نحسی کے سپرد کر دیے۔ جس نے بڑی خوش اسلوبی سے اس فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ملکہ کی تنہا حکومت کے نویں برس پانچ بڑے بڑے تجارتی جہاز، ایک روز ہوا موافق پا کر نیل کے پانیوں کو چیرتے ہوئے منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے وہ ملکہ کا مجسمہ بھی 'پنٹ' میں نصب کرنے کو ساتھ لے گئے تھے۔ یہ تمام سفر بحری تھا۔ پنٹ کے ساحل پر مصری کپتان اُترا تو وہاں کے حکمران پارحیو نے اپنی غیر معمولی فربہ ملکہ آتی اور تین بچوں کی معیت میں مصریوں کا پُرخلوص استقبال کیا۔ تحفے تحائف کا تبادلہ اور باہمی معاہدہ ہوا —

حطشپسوت کی یہ کامیاب تجارتی مہم سونا، چاندی، لاجورد، ملاکیت، سیپیاں، ہاتھی دانت، مصالحے، لوبان، گوند، رال، دارچینی، آبنوس، دیودار، صنوبر اور دیگر خوشبودار درخت، آنکھوں کا غازہ، بن مانس، بوزنے، بندر، زرافے، کتے، چیتے کی کھالیں اور کچھ مقامی باشندوں کو لے کر لوٹی — پنٹ سے مصر

کبھی بھی اس قدر اور اتنی مختلف نوعیت کی چیزیں نہیں آئیں ۔ ملکہ اور شہریوں نے تجارتی وفد کا شاندار استقبال کیا ۔ شیبہ کو دلہن کی طرح سجایا گیا ۔ ان بے بہا چیزوں کے دیکھنے کو لوگ گلیوں میں اُمنڈ آئے تھے ۔ ملکہ نے ایک خاص اجلاس طلب کیا اور اپنے محبوب امراء سخت اور غنی کو انعامات اور قربت بخشا کر انہیں خاص اپنے قدموں میں جگہ دی ۔ اس سامان میں سے ملکہ نے خوشبو کے انہیں درخت چیتے کی کھالیں، ۳۲۰۰ چھوٹے مویشی، صدف، آبنوس، ہاتھی دانت، مُر اور ایک زندہ چیتا، جو خاص طور پر ملکہ کے لئے پکڑا گیا تھا، آمن کے حضور نذر گزارا ۔

مصر کا سنہری دور

حطشی کا اکتالیس سالہ عظیم الشان اور حیرت کن دور حکومت مصری تاریخ کا زرّیں باب ہے ۔

اندرونی شورشوں سے مبرّا اور بیرونی خطرات سے پاک ۔ صرف ایک معمولی سی بدامنی کا پتہ چلتا ہے جو تھتمس سوم کے حامی نجاری بنوئی کے اشارے پر ملکہ کے خلاف ہوئی تھی ۔ ورنہ ہر طرف امن و سلامتی اور سکون کا دور دورہ تھا اور عام آدمی مطمئن اور خوش و خرم ۔ وہ خود بلا کی جوہر شناس تھی اور اسی خدا داد وصف کے سبب اپنے گرد وقت کے بہترین دماغ جمع کر لئے تھے ۔ یہ لوگ ملکہ کے ارادوں اور منصوبوں کو بڑی خوبی اور سلیقہ سے عملی جامہ پہناتے تھے ۔ چونکہ اس کی سوچی سمجھی تدبیروں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کامل امن و سکون کی ضرورت تھی اس لئے کوئی عسکری مہم نہیں بھیجی گئی اور ویسے حطشی ایسی عورت شمشیر زنی کے جوہر دکھاتی

بھی کیا۔

اس کے پیش رووں نے نوبیا اور مغربی ایشیا میں جو کامیاب یلغاریں کیں، ان کے سبب بیرونی دولت مصر میں خراج کی شکل میں سمٹی چلی آرہی تھی۔ حتشپسوت نے اس بے پایاں دولت کا رُخ، نظم و ضبط، تعمیر و ترتیب، تجارت، دکان کنی اور علوم و فنون کی ترویج کی طرف موڑ دیا۔ اٹھارھویں خاندان میں حتشپسوت پہلی فرمانروا تھی جسے کامل اطمینان اور ہر بیرونی و اندرونی اُلجھن سے آزاد ہو کر ملک کی اندرونی حالت سنوارنے کا موقعہ ملا اور اس نے اپنی اس اہم اور نازک ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا بھی۔۔۔۔

اسے ہمیشہ مرد ہی کہلانا پسند تھا۔ اکثر مردانہ لباس پہنتی اور مصنوعی داڑھی مونچھ لگایا کرتی۔ کتبوں تک میں اس کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یادگاروں میں وہ نسائی روپ میں صرف اس وقت ملتی ہے جب اسے ہاتھر دیوی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔

کوئی پچپن برس کی ہو کر یہ مشفق اور دُنیا کی سب سے پہلی عظیم ملکہ چل بسی۔ بعض کے خیال میں اس کا اکتیس سالہ طالع آزما بھتیجا توتمس سوم اب اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی سازش ہی اس کی موت کا سبب بن گئی مگر فی الحال اس کے ثبوت میں ٹھوس دلائل موجود نہیں ہیں۔ توتمس اپنی پھوپھی سے سخت متنفر تھا۔ اتنا کہ اس نے حتشپسوت کی عمارتوں سے ملکہ کا نام تک نکال ڈالا اور انھیں یا تو خود سے منسوب کر لیا یا پھر بری طرح مسخ کر ڈالا۔ حالانکہ یہی نیک دل

ملکہ تھی جس کے سبب توتمس کا حق تخت پر مضبوط ہو گیا تھا اور اسی شریف النفس
اور وسیع الظرف حتشپسوت کی بدولت توتمس کو پر امن، متمول اور مضبوط مصر ہاتھ آیا۔
اور اندرون ملک کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ فی الفور ایشیا پر چڑھ دوڑا۔

اور اس حتشپسوت کی ڈپلومیسی اور عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے
کہ اس نے بائیس برس تک اس توتمس سوم کو پوری طرح اپنی مٹھی میں دکھا جو مصر کا
سب سے بڑا اور "ڈپلومیٹ" فرعون ہو گزرا ہے اور جو تاریخ کے چند عظیم ترین
فرمانرواؤں میں سے ہے۔

شجرۂ نسب (فراعنۂ مصر کا اٹھارھواں خاندان)

آحمس نفرتری (ملکہ) ═══ (۱) آحمس

اَخوطپ (ملکہ) — (۲) آمنحوطپ اوّل

احموسی (ملکہ) — (۳) تحوتمس اوّل

(۵) حتشپسوت — (۴) تحوتمس دوم

نفرورا — حتشپسوت — (۶) تحوتمس سوم

ست حُرا (شہزادی) — نفرآمن (شہزادی) — (۷) آمنحوطپ ثانی

(۸) تحوتمس چہارم

توئمس — (۹) آمنحوطپ سوم

توئمش — (۱۰) آمنحوطپ چہارم (اخناتون)

آنخ نیپا آتن (شہزادی) ═══ (۱۲) توت آنخ آمن — مرت آتن (شہزادی) ═══ (۱۱) سمنخ کارا

(۱۳) آئی — (۱۴) حورم حب

(سمنخکارا اور توت آنخ آمن، دونوں اخناتون کے داماد تھے اور چاروں آخری فراعنہ کا نسبی لحاظ سے اٹھارھویں خاندان سے بظاہر کوئی تعلق نہ تھا)

”ایک اوّلین فاتح“

ساڑھے تین ہزار برس قبل اس شخص نے اپنی پالیسی
انہی خطوط پر تشکیل کی جن پر چل کر موجودہ دَور میں
انگریزوں نے سلطنت برطانیہ کی بنیادیں استوار
کیں ــــ تاریخ ہمیں اس سے پہلے کسی بھی فرمانروا
کی نشاندہی نہیں کرتی جو اس زیرک فرعون کی طرح
قوموں اور ان کے راہنماؤں کے جوہرِ آزادی
سلب کر لینے کا یہ بظاہر بے ضرر سا راز پا گیا ہو۔

توتھمس سوم ”تاریخ کا پہلا فاتح“
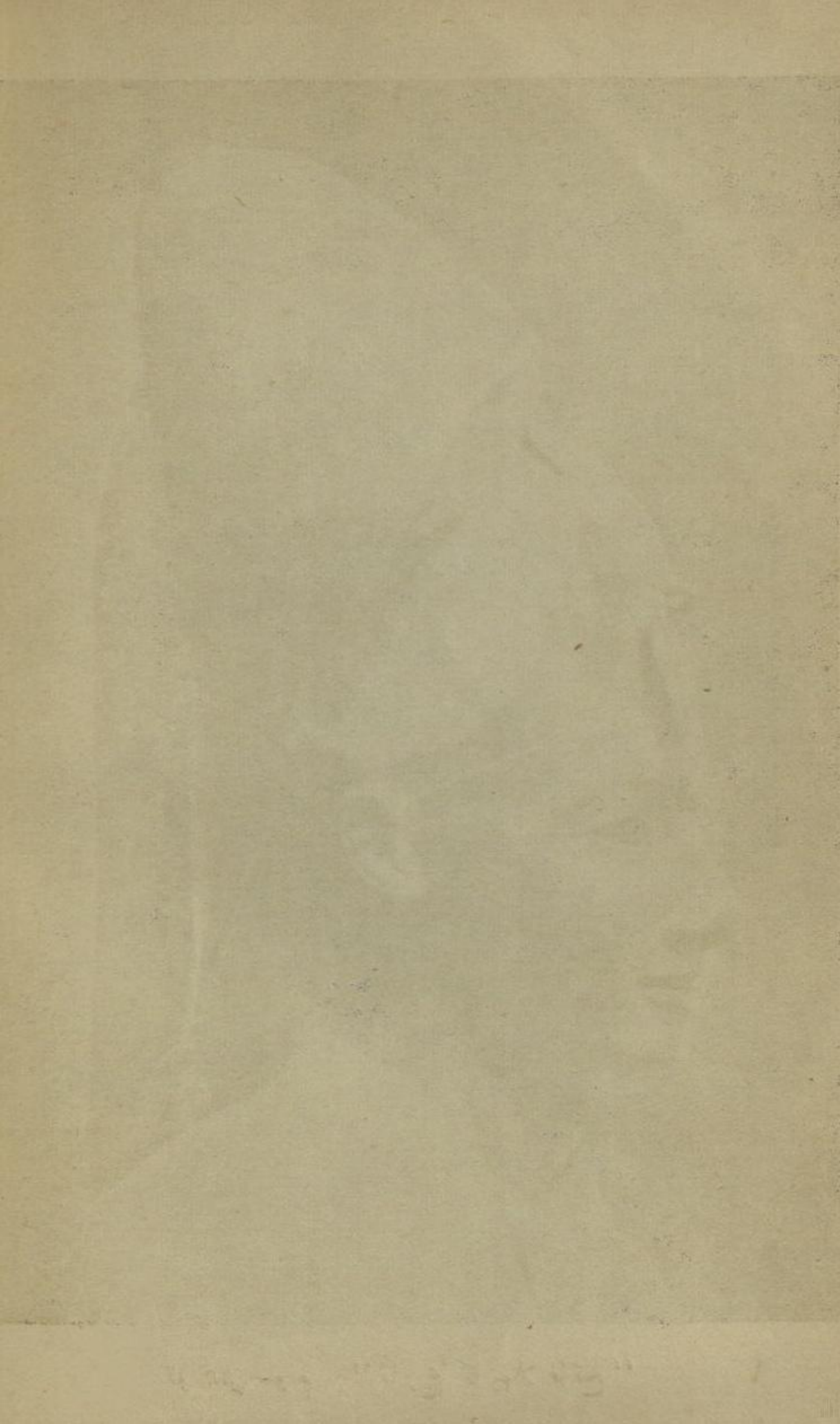
تُوتمِس

تاریخ نے بعض ایسی شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کا دورِ حکومت ماضی میں سنگ میل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ انہی ہستیوں میں سے فرعونِ مصر توتمس سوم بھی ہے۔ ۱۴۸۱ ق۔م سے لے کر ۱۴۴۹ ق۔م تک کے درمیان بتیس برس کا وہ اہم عرصہ ہے جب دنیا کے اوّلین ہیرو اور بین الاقوامی فاتح توتمس نے تاریخ میں پہلی بار ایک قلمرو قائم کی۔ یہی وہ وقت تھا جبکہ قریباً سارا مغربی ایشیا، جنوبی سوڈان، نوبیا، سومالی لینڈ، ایجیئن کے جزائر، حتیٰ کہ اٹلی اور یونان کے ساحلی علاقے بھی ازمنۂ قدیم کے اس عظیم ڈپلومیٹ کو خراج ادا کر رہے تھے۔ انہی بتیس سالوں میں وہ اسباب رونما ہوئے جنھوں نے ہزارہا سال تک قریباً ایک ڈگر پر چلنے والے مصری تمدن کے ہر گوشے ــ علوم و فنون، رسم و رواج حتیٰ کہ مصریوں کے مخصوص خدوخال تک کا رُخ قطعاً مخالف سمت میں موڑ دیا۔

پھوپھی کے سایۂ عاطفت میں

جب اس کا باپ توتمس دوم مرا تو یہ نو برس کا تھا۔ اس کی پھوپھی

---

[1] توتمس دوم، توتمس سوم اور حتشپسُت کے رشتوں کی تفصیل پچھلے مضمون میں آچکی ہے۔

حطشی سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ فراخ دل حطشی نے کمسن بھتیجے کے ساتھ نہایت مشفقانہ برتاؤ کیا۔ خاوند کی موت کے بعد بچپن کے چھننے کی چار تاریخ کو اس نے توتمس سوم کی تاجپوشی بھی کرائی۔ دربار میں اسے ہر وقت ساتھ رکھتی تھی اور اتنا اعزاز بخشا کہ اس سے اپنی چھوٹی بیٹی حطشپ سط (معنی ذی وقار خاتون) بھی بیاہ دی اور اس طرح گویا اسے اپنے بعد تخت کا جائز حق دار بنا دیا۔

بعض علما کے خیال میں مصر کے اس سب سے بڑے ڈپلومیٹ کو اکتیس سال کی عمر تک اپنے دن ایک مندر کے پجاری کی حیثیت سے گزارنا پڑے اور جرمن محقق بروغش تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ اپنا ابتدائی ایام حطشی کی وجہ سے ان دور دراز دلدلی اضلاع میں بسر کرنے پر مجبور ہوا جہاں معزول شدہ بھگوڑے فرمانروا پناہ لیا کرتے تھے۔ لیکن ہمیں ان ماہرین کا یہ نظریہ کسی طرح بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اگر توتمس سوم فی الواقع حطشی کی پوری زندگی میں سیاسی امور سے اسی طرح معطل اور گوشہ نشینی و گمنامی کی حالت میں پڑا رہتا تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ حکومت سے کلیتہً بیگانہ اور غیر متعلق شخص اتنا زبردست سیاست دان، منتظم اور مدبر ثابت ہوتا جس کا جواب مصر کی پوری تاریخ میں تو خیر ہے ہی نہیں، تاریخ عالم میں بھی کم ہی ملتا ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر حطشی نے

لہ

توتمس کو ایسا ہی عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا تھا تو اس عظیم عورت کی موت کے صرف دو ماہ بعد ہی وہ اپنی ان عظیم عسکری کامرانیوں کا سلسلہ کیسے شروع کر سکتا تھا۔ جن کی وجہ سے حطشپ کے یہ معترضین علما بھی توتمس کو "مصر کا سکندر" اور "نپولین مصر" جیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔

اس سے ہمیں انکار نہیں کہ حطشپ نے توتمس کو سیاسی اہمیت کبھی بھی حاصل نہ ہونے دی۔ لیکن اس کے لئے اس نیکدل اور شفیق ملکہ کو کسی طرح بھی موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ توتمس کے حمایتی پجاریوں اور بعض امرا نے حطشپ کے خلاف جو بغاوت کرائی تھی اس کا، ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں اور خود ملکہ کی عالی حوصلگی کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ طالع آزما بھتیجے کو کنٹرول میں رکھے اور اگر ملکہ چاہتی تو اپنے ننھے حریف کو ہمیشہ کے لئے بآسانی راستہ سے ہٹا سکتی تھی۔

بہرحال باپ کو تو موقعہ ہی نہیں ملا کہ وہ بیٹے کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر کراجاتا۔ یہ فرض تو عالی ظرف حطشپ نے سرانجام دیا اور اسی کی نگرانی میں پورے بائیس برس تک توتمس نے آئینِ جہانبانی کے اسرار و رموز سیکھے۔ توتمس کو چند مدبرینِ عالم میں جو نمایاں درجہ حاصل ہے اس کا اصل سرچشمہ درحقیقت حطشپ کی ذات تھی۔

اس کے حملے حطشپ کے بعد قریباً اکتیس برس کی عمر میں مینفر کے مہینے کی چار تاریخ کو وہ مطلق العنان فرعون بنا اور تاجپوشی کے محض دو ماہ بعد ہی وہ ایشیا پر چڑھ دوڑا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ کوئی پچاس برس

پہلے ایشیائیوں کو حطشی کے جنگجو باپ تحتمس اول کے ہاتھوں جو سخت مار پڑی تھی۔ حطشی کے اکتالیس ۴۱ سالہ خاموش و پرسکون دور نے بھلادی اور اب وہاں مصر سے بھاگے ہوئے ہائیکسوس اور کدیش کے حکمران کے اکسانے پر مصری بالادستی سے چھٹکارا پانے کے لیے منظم تیاریاں ہو رہی تھیں۔

تحتمس کی دور رس نگاہیں پھوپھی کی زندگی ہی میں اس خطرے کو بھانپ چکی تھیں۔ چنانچہ اس کے مرتے ہی اس طوفان کے پھٹ پڑنے سے قبل یہ نڈر انسان ایشیائیوں کے سروں پہ جا پہنچا۔ وہ جن حالات میں برسر اقتدار آیا تھا۔ سیاسی طور پہ وہ مصری شہنشاہیت کے لیے قطعاً نامساعد تھے اور اس سے پہلے کسی بھی فرعون کو اس قدر زبردست اور متحدہ غنیم سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس شخص نے پے بہ پے سترہ ۱۷ حملوں میں مغربی ایشیا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

مگدو کی لڑائی

بہر حال تخت نشینی کے صرف دو مہینے بعد کوئی تیس ہزار فوج لے کر وہ "فارموتی" کے مہینے میں سرحدی مقام "زالو" آگیا۔ اور ۱۹ اپریل ۱۴۸۱ ق۔م (بقول بعض ۱۴۷۹ ق۔م) میں مصری سرحد سے روانہ ہوا اور نو ۹ دن میں ایک سو ساٹھ ۱۶۰ میل چل کر فلسطینی شہر "غازہ" پر قبضہ کر لیا۔ یہاں وہ صرف ایک رات رکا اور پھر ارمئی کو وہاں سے نوے ۹۰ میل پرے "یہم" آپہنچا۔ ادھر مشہور شہر کدیشہ کے حکمران کی رہنمائی میں ایشیائی اتحادیوں نے ایک مضبوط اور اہم قلعہ مگدو پر قبضہ کر لیا۔ "یہم" میں تحتمس

کو مخبروں نے مگدو پر اتحادی قبضہ کی اطلاع دی ــــــ

یہاں سے مگدو کو تین راستے جاتے تھے۔ دو تو کافی طویل تھے تیسرا سب سے چھوٹا تو تھا لیکن تھا بھی سب سے زیادہ خطرناک۔ توتمس اسی چھوٹے راستے سے گزرنا چاہتا تھا لیکن اس کے افسر دور اندیشی کی بنا پر اس کے خلاف تھے۔ وہ نہ مانا۔ "تم چاہو تو بڑے راستوں سے جا سکتے ہو میرا راستہ یہی ہوگا"

وہ سب سے آگے چل رہا تھا اور بغیر کسی نقصان کے ایک ہفتہ میں مگدو آ پہنچا۔ بڑی خوفناک جنگ لڑی گئی تین سو تیس شاہزادے مصری فرعون کے خلاف نبرد آزما تھے۔ توتمس نے ذاتی شجاعت کے تحسین آمیز مظاہرے کیے۔ کدیشہ کا حکمراں بمشکل جان بچا کر بھاگا۔ بیٹا گرفتار ہو گیا، قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ۹۲۴ جنگی رتھ ۲۱۳۲ گھوڑے ۱۹۲۹ بیل ۲۰۰۰ چھوٹے جانور ۲۰۵۰۰ دیگر مویشی، ۲۰۰ زرہ بکتر، بے شمار ہتھیار، سنہری برتن، اور محل سے ۸۷ بچے اور ۱۷۹۶ مرد و عورتیں ہاتھ آئیں۔

اس تمام مال غنیمت کو سمیٹتا، اتحادی بادشاہوں کی تقصیر معاف کرتا وہ لبنان چلا گیا۔ وہاں کے تین شہروں، انونم، اناؤگاس اور ہرنکل پر قبضہ کیا اور پھر شمالی فلسطین میں امن بحال کر کے مصر لوٹ گیا۔

جنوبی شام اور فلسطین کے راستے سے اس نے اپنا دوسرا اور تیسرا حملہ پھر ایشیا پر کیا۔ چوتھی یلغار کا حال نہیں مل رہا ــــــ

اس کا جنگی بیڑہ | اب توتمس اچھی طرح بھانپ چکا تھا کہ فیونیشیہ کے سواحل

شہروں کی تسخیر کیلئے بنا نہ تو وہ بآسانی شمال میں لبنانی علاقوں میں بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے بدترین غنیم کدیشہ پر حملہ آور ہو سکتا ہے اور جب تک کدیشہ نہیں فتح ہو لیتا عراق اور متانی دعیرہ پر حملہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے ایک زبردست بحری بیڑہ تیار کیا اور اس کی کمان اپنے ایک معتمد خب آمن کو سونپ دی اور اس زبردست اور منظم بیڑے نے توتمس کی کامرانیوں میں برابر کا حصہ لیا بھی۔

اس کی بحری فوج کی ترکتازیوں سے یونان اور اٹلی کے سواحل بھی نہ بچ سکے۔ خود توتمس نے شام اور فینیشیہ پر کئی بحری حملے کیے۔ پانچویں مہم کا آغاز کر کے اس نے شمالی فینیشیہ میں فوجیں اتار دیں اور بغیر لڑے بھڑے صور پر قبضہ کر کے اس نے مضبوطی سے وہاں اپنے قدم جمائے۔ فینیشیہ کے امیروں نے اطاعت قبول کر لی۔

کدیشہ کی فتح

اب اس کی تمام تر توجہ اپنے دیرینہ اور خطرناک دشمن والئ کدیشہ کی طرف تھی۔ لھذا چھٹی بار یہ ان تھک انسان جہازوں میں سوار ہو کر شامی ساحل پر اترا اور تیزی سے آگے بڑھ کر کدیشہ کو محصور کر لیا۔ اہلِ کدیشہ نے مصری رتھوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے ایک وحشی گھوڑی چھوڑ دی لیکن توتمس کے دلیر اور قابل جرنل آمن امحب نے تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیا اور اس کی دُم اپنے آقا کے قدموں میں لا کر ڈال دی۔ کدیشہ فتح ہو گیا۔

اس جنگ میں بھی انفرادی شجاعت میں خود توتمس اور آمن امحب ممتاز رہے۔

تونمس نے نہایت وسیع القلبی سے کام لے کر اپنے خوفناک دشمن کدلیشہ کو معاف کر دیا۔ موسم برشگال ہو چکا تھا اور یہ زیرک شخص شام کے پچاس یا ساٹھ نوعمر شاہزادوں کو مصری طریق پر تعلیم و تربیت دینے کے لیئے ساتھ لے گیا۔

اس کا سب سے بڑا حملہ

ساتویں حملہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ ویسے اس کا یہ حملہ شام کے ساحلی شہر 'اُلّدتزا' پر ہوا اور شام کی تمام بندرگاہوں اور شہروں میں نظم و نسق بحال کیا۔ ان ساحلی شہروں پر اس نے حملہ اس لیئے کیا کہ کدیشہ کی جنگ کے دوران میں یہاں سرکشی کے آثار اُبھرنے لگے تھے۔

اپنی حکومت کے نویں برس اس نے کوئی یلغار نہیں کی بلکہ سب سے بڑے حملے کی منظم اور وسیع پیمانے پر تیاریوں میں ہمہ تن مصروف رہا۔

اور وہ دسویں برس، وہ شامی بندرگاہ 'سمیرا' اور 'اَرمائنہ' کے کدلیشہ جانے والی شاہراہ پر ہو لیا اور پھر شمال کی طرف بڑھ کر 'کینتے' اور 'سنتہ ر' نامی شہروں پر قبضہ کرکے عراق میں جا گھسا اس مہم میں سے 'حلب' کے جنوب میں اسے پہلی سخت جنگ لڑنا پڑی۔ حلب کی فتح کے بعد وادیٔ فرات اس برق رفتار فاتح کے رحم و کرم پر تھی۔ آگے بڑھ کر وہ شمال میں دریا فرات کی طرف مڑ کر 'کارقمیش' پہنچ گیا۔ یہاں اس نے 'متانی' کے آریائی حکمران کو سخت شکست دی۔ ایک مصری کتبے کے الفاظ میں ـــــ

"ان دشمنوں میں سے کسی ایک نے بھی پیچھے پھر کر نہ دیکھا اور

پہاڑی بکریوں کی طرح چمپت ہو گئے۔"

تونمس کے مایۂ ناز جرنیل آمن اَمحب نے بڑی تن دہی سے ان بھگوڑوں کا پیچھا کیا اور پھر تونمس نے نیتوا (مصریوں کا 'نی' یا 'نی نی') پر حملہ کر کے ایشیا کی سب سے بڑی عسکری طاقت 'اشوریہ' کو دعوتِ مبارزت دی۔ نیتوا اس وقت اشوریوں کا دارالحکومت تو نہ تھا البتہ اہم شہروں میں سے تھا۔ 'اشوریہ' کے حکمران نے مصری فاتح کو خراج دے کر تعلقات استوار کرنے ہی میں خیریت دیکھی اور ایشیائے کوچک کی سب سے مضبوط طاقت 'حتّی' کے فرمانرواؤں نے بھی خراج پیش کیا۔

تونمس اور آمن اَمحب حسبِ معمول اس جنگ کے بھی ہیرو تھے۔ اس عظیم اور کامیاب مہم سے واپسی پر اس نے 'نبی' (وسطی فرات اور کوہستان زگرس کے درمیانی) کے علاقے میں ہاتھیوں کا شکار کھیلا اور ایک سو بیس ہاتھی مارے۔ یہیں ہاتھیوں کے گلّے کا تعاقب کرتے ہوئے ایک موقع پر غضب ناک ہاتھی تونمس پر حملہ آور ہوا اور قریب تھا کہ عظیم جرنیل لقمۂ اجل بن جائے لیکن جاں نثار آمن اَمحب پھر آڑے آیا اور تلوار سے سونڈ کاٹ لی۔

اس حملے کے بعد اسے وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کے خواب وہ ملکہ کے پُرامن دور میں دیکھا کرتا تھا اور اپنی آزاد حکومت کے دس برس سے جس کے حصول کے لیئے وہ برابر تلواریں مار رہا تھا — لیکن خاموش وہ پھر بھی نہیں بیٹھا بلکہ لبنان پر اس نے پھر ایک مرتبہ یلغار کی —

اسی اثنا میں عراق وغیرہ کے بادشاہ حلب کے فرمانروا کی سرکردگی میں متحد ہو کر ایک بار اور قسمت آزمائی کے لیئے نکل گئے۔ ان کے جذبہ اور تعداد کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس مرتبہ مصری فاتح سب کچھ کھو دے گا۔ مستعد فرعون نے ان کا چیلنج قبول کر لیا اور اراثنہ کے مقام پر ایک شدید لڑائی کے بعد اتحادی میدان چھوڑ بھاگے۔ توتمس کا یہ دسواں حملہ تھا۔

گیارھویں اور بارھویں حملے کا حال معلوم نہیں ہے۔ تیرھواں لبنان اور چودھواں مصر کی شمال مشرقی سرحدوں پر بسنے والے شاسو (بدوؤں) پر ہوا۔ سولھواں حملہ خاص مشہور نہیں ہے۔

شامی شاہزادوں کی ایک مرتبہ پھر جو شامت آئی تو بڑے جوش و خروش سے اٹھے۔ کدلشہ کا حکمران بھی ان سے مل گیا۔ توتمس نے فوراً تونپ پر قبضہ کر کے کدلشیہ کو محصور کر لیا اور حسب معمول اتحادیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تمام ایشیائی حریفوں کی قوت پارہ پارہ ہو گئی اور اب وہ چپکے ہو کر بیٹھ رہے۔

اس کی موت

آخری ایشیائی مہم کے بارہ سال بعد ۱۷ مارچ ۱۴۷۹ قبل مسیح (بقول بعض ۱۴۴۷ قبل مسیح) کو یہ ان تھک انسان چل بسا۔

اس کی موت ایک کامران انسان کی موت تھی۔ ان مغربی فاتحین سکندر و نپولین کی طرح وہ ناکامی، نامرادی یا بزدلی اور ذلت کی موت نہیں مرا جن کے سالفہ علمائے مغرب، مشرق کے اس مایۂ ناز فرزند (توتمس) کو تشبیہہ دے کر

بزعم خود اس کی اہمیت و عظمت جتلانا چاہتے ہیں ـــــ اس عظیم انسان نے فینونشیہ (مصریوں کا 'کیفا') قبرص (مصریوں کا 'اسیبی') کریٹ، ایجیئن کے جزائر، ایشیائے کوچک، بابل، اشوریہ، ارتانی، شام، فلسطین، لبنان، نوبیا، سومالی لینڈ، جنوبی سوڈان، کش، مغربی صحارا، یوتمان کے سواحلی علاقوں اور اٹلی کے جنوبی ساحلوں تک سے خراج وصول کیا۔ اہلِ تھیبہ کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا تھا جب وہ گلیوں، دروازوں اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر بے بہا مالِ غنیمت اور لاتعداد افریقہ کے حبشی اور ایشیا کے خوش شکل جنگی اسیروں کو گزرتے دیکھتے اس حال میں کہ پھٹے خشک ہونٹ، خاک آلود چاک شدہ کپڑے، عورتیں بچوں کو اٹھائے ـــــ الم و یاس کی تصویر بنے سر جھکائے ہوتے اور ان کے آگے پیچھے اور درمیان میں مصری سپاہی سینہ تانے چل رہے ہوتے۔

ان یلغاروں کے دُوررس اثرات

توتمس کی ان یلغاروں کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ان سے پیدا شدہ نتائج کے سبب مصر کی ہزار ہا سالہ قدیم مخصوص تہذیب و تمدن میں انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا اور مصریوں کے ہر رُخِ زندگی پر ایشیائی رنگ چڑھ گیا۔

توتمس سے بہت پہلے گو مصر ساتویں خاندان کے زمانے میں لیبیا والوں کے اور نویں، چودھویں خاندان کے وقت ایشیائیوں کے زیرِ اثر رہا۔ لیکن مصر کے قومی کردار اور علوم و فنون وغیرہ پر کوئی خاص اثر ان لوگوں نے نہیں ڈالا۔ اس لیے کہ یہ حملہ آور مصریوں سے کہیں کم تہذیب یافتہ تھے اور ایسی کوئی خصوصیت

ان میں نہ تھی جس سے متاثر ہو کر مصری ان کے رنگ میں رنگے جاتے۔ پھر یہ کہ ان غیر ملکیوں کے حملوں کی وجہ سے اونچا طبقہ تو جنوب کو بھاگ جاتا تھا، رہا مصری کاشتکار، سو وہ اپنی کھیتی باڑی میں مگن تھا ان سے اثر قبول کرتا ہی کیا۔ اس لیے مصری ان غیر ملکیوں کی تہذیب سے قریباً غیر مانوس ہی رہے۔

لیکن جب تھوتمس نے اپنی یلغاروں کا سلسلہ شروع کیا تو اس کے عہد کے بتیس برسوں میں مصری غیر ملکیوں سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے شامیوں وغیرہ میں گھل مل گئے۔ مصریوں نے شامیوں کے اعلیٰ طبقے کو بھی جگہ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور نہیں کیا تھا بلکہ شام ہی میں ان سے خوب ربط ضبط ہو گیا۔ پھر یہ کہ شامی تہذیب، مصری تمدن سے کسی طرح بھی گھٹیا نہ تھی بلکہ اس کے کئی گوشے تو مصریوں کی تہذیب سے بھی برتر تھے۔

خاص بات یہ ہے کہ مصریوں نے شام جا کر نہیں بلکہ اپنے ہی ملک میں رہ کر مفتوحین کا پورا پورا اثر قبول کر لیا۔ وہ یوں کہ تھوتمس کے حملوں کے سبب بے شمار اعلیٰ و ادنیٰ شامی اور عراقی غلام بنا کر مصر لائے گئے۔ تھوتمس کے گیارہ حملوں کی جو تفاصیل مل رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان گیارہ حملوں میں ۷۵۰۰ ایشیائی گرفتار ہو کر آئے۔ یہ تعداد تو صرف وہ ہے جو دستبرد زمانہ سے بچ رہی ہے اور جو مٹ چکی ہے اس کا پتہ ہی نہیں۔ مزید یہ کہ یہ غلام ان عورتوں اور مردوں کے سوا ہیں جو بطور خراج ہر سال برابر مصر آ رہے تھے۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ مصری حکومت خراج میں ہنرکاروں اور کاریگروں کا خاص طور پر مطالبہ کرتی تھی۔

مصر کے اونچے طبقے کے محلات اور گھر ایشیائی خوبصورت مردوں اور عورتوں سے بھرے رہتے تھے۔ اتنے غیر ملکی مصری گھرانوں میں جا پہنچے تو لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مصری تہذیب کا ہر رُخ رفتہ رفتہ ایشیائی ہو گیا۔

مصریوں نے چونکہ خوش شکل ایشیائی عورتوں سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے تھے نتیجتاً آمنحوطپ سوم کے زمانے میں آن کر اہلِ مصر کے خدّوخال واضح طور پر ایشیائی ہو چکے تھے۔ اس وقت کرخت، روکھے، چست اور بارعب مصری نقوش کی بجائے بڑے ملائم، نازک و نفیس، چھوٹی خوشنما خمیدہ ناک اور ہلکے تبسم چہرے دیکھنے میں نظر آ رہے ہیں۔

ان ہی عورتوں نے مصریوں کی زبان، تخیلات اور عادات و اطوار پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا اور چند ہی نسلوں بعد مصری زبان اور لٹریچر میں سامی اور ایشیائی محاوروں، الفاظ اور تخیلات و احساسات کی بھرمار ہو گئی۔ اِدھر ایشیائی فنکاروں نے اپنے اثرات مصری آرٹ میں پوری طرح سمو دیئے۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی مصنوعات مثلاً موتی، منکے، آئینے، فرنیچر اور دیگر روزمرّہ کی چیزوں میں بارھویں خاندان سے لے کر ہطشی کے دورِ حکومت تک جو غیر متبدل یکسانیت چلی آ رہی تھی اس میں فوری طور پر قطعاً تنوع پیدا ہو گیا۔ قدیم مصری موٹا اور بھدا رسم الخط، جس میں پانچویں خاندان سے لے کر آمنحوطپ اول (۱۵۶۲/۱۵۴۱ ق۔م) کے زمانے تک قریباً کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، اب اچانک مختلف یعنی پتلا، رواں اور خوشنما ہو گیا۔ غیر ملکی غلاموں کی دیکھا دیکھی مصریوں نے کوٹ پہننا شروع کر دیا۔ بالوں کی آرائش اور

سالس کی وضع تک بدل گئی ---- بربط وچنگ بھی اب مصر میں دیکھنے میں آرہا ہے۔

غرض معاشرت، زبان وادب، مصوری و نقاشی، تعمیر و رنگ سازی اور دیگر علوم وفنون میں مصری اپنی روایات قطعاً ترک کر بیٹھے جو شروع سے یکساں اور ایک ہی ڈگر پر چلی آرہی تھیں اور اس طرح اپنی قدیمی روش کو چھوڑنے اور پرانی آبائی زنجیریں توڑ کر نئے تجربات اختیار کر لینے کے بعد مصریوں کے لیئے ناممکن ہوگیا کہ وہ دوبارہ اپنی قدیم طرز کی طرف پلٹ پڑتے لہٰذا مخصوص اور دیرینہ "مصریت" تغیر پذیر ہوتی رہی اور ساتھ ساتھ اسے زوال آتا گیا۔ حتیٰ کہ جب مصر میں یونانی دور آیا تو جملہ مصری علوم و فنون کو بالکل زوال آگیا ----

وہ بحیثیت مدبر اور منتظم

وہ نرا جنگجو ہی نہیں تھا بلکہ مدبر اور سیاستدان کی حیثیت سے بھی مصری تاریخ میں اس کا کوئی جواب نہیں ---- ساڑھے تین ہزار برس پیشتر اس شخص نے اپنی پالیسی انہی خطوط پر تشکیل کی جن پر چل کر موجودہ دور میں انگریزوں نے "سلطنتِ برطانیہ" کی بنیادیں استوار کیں۔

ایشیائیوں پر اپنی گرفت اور غلامی کا جوا مضبوط کرنے کے لیئے ایک دور رس بے حد خطرناک لیکن بظاہر بے ضرر سی چال چلا۔ وہ یہ کہ بیرونی مقبوضات کے کم سن شاہزادوں کو مصر لیجا کر وہاں ان کی تعلیم و تربیت شاہانہ لیکن اس طریقہ پر کراتا کہ ان کے دماغوں سے آزادی یا قوم پرستی کی خوبو بالکل جاتی رہتی اور وہ ذہنی طور پر بالکل "مصری" ہوجاتے۔ باپ کی موت کے بعد شاہزادے کو اس کی

ریاست سونپ دی جاتی۔ رعایا اپنی جگہ مطمئن کہ ان کا اپنا شہزادہ ان پر حکمران ہے اور وہ اپنی جگہ خوش کہ حکومت اس کے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن غلامی پر شاکر رہنے کا جو زہر توتمس نے اس کی رگوں میں بھر دیا تھا اس نے غلامی اور آزادی کا فرق سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ اس زبردست ڈپلومیٹک فرعون کی اس عظیم الشان پالیسی اور عسکری کارناموں کے پیدا شدہ نتائج سے اس کی چار نسلیں مستفید ہوتی رہیں۔ تاریخ ہمیں توتمس سے پہلے کسی بھی ایسے حکمران کی نشان دہی نہیں کرتی جو اس زیرک فرعون کی طرح قوموں اور ان کے راہنماؤں کے جوہر آزادی سلب کر لینے کا یہ آسان لیکن خوفناک راز پا گیا ہو۔

ایشیائی مقبوضات کی نگرانی کے لیے اس نے ایک وائسرائے مقرر کیا۔ وہاں اس کا سب سے پہلا وائسرائے اس کا مشہور جرنیل ثوتی تھا۔ مقامی شہری ریاستوں کے حکمرانوں کا تعلق مصری وائسرائے کے انتظام کے ساتھ کس حد تک اور کس نوعیت کا ہوتا تھا اس کے متعلق وثوق سے تو تا حال کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ والیانِ ریاست اپنے محاصل خود جمع کرتے اور فرعون کا حصہ نکال کر روانہ کر دیتے تھے۔

خود سر اور ہمہ وقت بغاوت پر آمادہ رہنے والے ایشیائیوں کو دبائے رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ پورے شام اور فلسطین میں خاص طور پر مستقلاً مصری فوج رکھی جائے۔ چنانچہ توتمس کے نام پر متعدد قلعے تعمیر کر کے ان میں فوج رکھی گئی۔ قلعدار فرعون کے نائب کی حیثیت سے فوری ضرورت کے وقت احکام

صادر کرتا اور ان پر عملدرآمد کراتا تھا۔ (یہی کچھ بعد کے فرعونوں کے زمانے میں بھی ہوتا رہا)

اٹھارھویں خاندان کے فرعونوں، خصوصاً خلتشی اور توتمس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک کی اقتصادی اور زرعی حالت بہتر سے بہتر بنائی جائے۔ حضرت یوسفؑ کے زمانے کی طرح ملک کی بیشتر زمینیں اب بھی براہِ راست تاج کے کنٹرول میں تھیں۔ کسانوں کے علاوہ ان زمینوں میں حکومت کے ملازم اور غلام بھی کاشت کرتے تھے۔ معتمد امراء اور فرعون کے لواحقین میں بھی یہ زمینیں تقسیم کردی جاتیں۔ توتمس کے عمّال کی نگرانی میں کاشتکاروں کو ہر ممکن سہولتیں پہنچائی جاتیں۔

مندروں سے متعلقہ جاگیروں کو چھوڑ کر ذاتی ملکیت کا اندراج باقاعدہ رجسٹروں میں ہوتا تھا اور اسی اندراج کی بنیاد پر ٹیکس عائد کیے جاتے جن کی وصولی مویشی، اناج، شراب، تیل، روغن، شہد اور کپڑے وغیرہ کی شکل میں کی جاتی تھی لیکن اس نے بڑی سختی سے ان سب مظالم کا کلی انسداد کر دیا جو محصول کی وصولی کے وقت سرکاری عمّال رعایا پر روا رکھتے تھے

ایک قسم کا ٹیکس سرکاری حکام کو بھی اپنے دفتر کی طرف سے دینا پڑتا تھا جس کی ادائیگی عموماً سونے، چاندی، مویشی اور قیمتی پارچات کی شکل میں ہوتی تھی مثلاً الکب کا رئیس بلدیہ سالانہ ۲۸۰۰ رتی سونا، ۲۱۰۰ رتی چاندی اور ایک بیل ــــ اور اس کا نائب ۱۲۰۰ رتی چاندی، ایک طلائی ہار، دو بیل اور قیمتی کپڑوں کے دو صندوق

جمع کراتا تھا۔

ممالکِ غیر سے جو خراج اور تحائف آتے ان سب کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ اب کلرکوں اور انتظامیہ کے دیگر کارکنوں کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیئے باقاعدہ محکمہ کی تشکیل توگو حطشی کے دورِ حکومت میں ہو چکی تھی البتہ تونمس کے زمانے میں اس میں مزید توسیع کی گئی۔

جملہ امورِ سلطنت پر تونمس خود نگاہ رکھتا تھا البتہ جب کبھی وہ یلغاروں کے سلسلے میں مصر سے باہر ہوتا تو اس کی غیر موجودگی میں اس کے قابل اور معتمد امراء خوش اسلوبی سے ہر ذمہ داری نبھاتے تھے۔ خزانچی وزیر کے ماتحت ہوتا تھا، جسے وہ ہر صبح رپورٹ پیش کرتا اور اس کے بعد وہ دفتروں اور مال گوداموں کو کھولنے کی اجازت دیتا اور روزمرّہ کا کام شروع ہو جاتا تھا ـــــ اس کے زمانے میں مندرجہ ذیل ملکی عہدے تھے:

(۱) وزیرِ اعظم (۲) صحراؤں کے گورنر (۳) جنوب کا گورنر (۴) ایشیا اور کش کا وائسرائے (۵) تھیبہ کا کوتوال (۶) محلات کا نگران (۷) بندرگاہوں کا ناظم (اس شخص کا ہیڈ کوارٹر تھیبہ ہی میں تھا) ـ (۸) شاہی وکیل (۹) شاہی پیامبر اور نقیب (۱۰) شاہی اسلحہ بردار (۱۱) شاہی بیڑی کا نگ (۱۲) شاہی خانساماں (۱۳) شاہی پنکھا بردار (۱۴) فوجی جرنیل (۱۵) اعلیٰ ریکارڈنگ آفیسر (۱۶) مختلف مہا پجاری۔

اس کا مشہور ترین وزیر رخمارا تھا جس کی نگرانی میں جنوبی مصر کا نظام بڑی عمدگی

سے چل رہا تھا۔ رخمارا کے علاوہ اس کو وقت کے جو بہترین دماغ، وفادار جرنیل اور مشیر میسّر تھے ان کے نام یہ ہیں:۔

من خیپر، رس نب انخی، انتف، اور روقائع نگار، ثانینی۔۔۔

اس کے مشہور جرنیل یہ تھے:۔

(۱) ثوتی ۔ یہ توتمس کا محبوب ترین شخص تھا۔ توتمس نے اس کی بیٹی سے شادی بھی کر لی تھی۔ اس شخص کو بہت اختیارات حاصل تھے اور یہ مصری عوام میں بھی بہت مقبول تھا۔ توتمس نے اپنی فتوحات کے آخری دور میں اسے شام کا گورنر بنا دیا تھا۔

(۲) آمن امحب (۳) نب آمن (امیر البحر) (۴) طاآنینی

اس کا بیشتر وقت گو جنگوں کی نذر ہو گیا اس کے باوجود اندرونِ ملک امن و سکون کا دور دورہ تھا اور وہ بدنظمی، راہزنی، ناانصافی اور دیگر خرابیوں کا مکمل استیصال کر چکا تھا۔

شخصی جائزہ

توتمس سوم اپنے موحد پوتے "اخناتون" کو چھوڑ کر مصر کی سب سے اہم شخصیت ہے۔ اس کی فتوحات، جنگجویانہ کردار کو دیکھ کر نظرِ بظاہر یہی گمان گزرے گا کہ وہ نہایت خونخوار، ظالم اور نرا سپاہی آدمی رہا ہو گا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ نہایت عفو پرور، رحم دل اور عالی ظرف انسان تھا اور یہی اس کے کردار کا روشن پہلو ہے۔

ایک شریف لیکن بہادر دشمن کی طرح وہ اپنے بدترین دشمنوں تک کو معاف کر دیتا

اور اسیر سلاطین کا شاہانہ استقبال کرتا تھا۔ یہ مستعد چست و چالاک اور بلا کا ذہین انسان اپنے دادا تھتمس اوّل اور بیٹے آمنحوطپ دوم کے برعکس مقتول دشمنوں کی تشہیر سے ہمیشہ گریز کرتا رہا ـــــ ایشیائی اس کے خلاف جتنی بھی تدبیریں کرتے اس کی ایک ہی جنبش سے وہ سب تار تار ہو کر رہ جاتی تھیں۔ جس کامیاب عسکری برق رفتاری کا مظاہرہ مصر کے اس مُدبر اور عالی حوصلہ فرعون نے کیا وہ چنگیز کے علاوہ اور کوئی نامور فاتح نہیں کر سکا ہے۔ اس کی موت کے بعد بھی اس کی یاد اور ہیبت تین نسلوں تک باقی رہی۔

ایک طرف اگر یہ بے خوف کھلنڈرے کی طرح خوفناک ہاتھیوں کے شکار میں مشغول نظر آتا ہے تو دوسری طرف ناخنِ تدبیر سے بڑی بڑی سیاسی گتھیاں سلجھاتا ملتا ہے۔ ایک طرف وہ ایشیا میں یلغاروں کا تانتا باندھے ہوئے ہے تو دوسری جانب اس کی دوربین نگاہیں تمام ملکی کمزوریاں رفع کر رہی ہوتی ہیں ـــ

حطشپسوت کی عمارات کو بُری طرح مسخ کرا کے یا ان کو اپنے نام سے منسوب کر کے اس نے جو افسوس ناک اقدام کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جذبۂ نفرت و انتقام بھی کس قدر خوفناک ہوتا ہوگا کہ جب بھڑک اٹھتا تو آسانی سے سرد بھی نہ ہوتا ہوگا۔ اپنے اس طرزِ عمل سے وہ احسان فراموش بھی ثابت ہوتا ہے۔

ایشیائی غلاموں سے بیگار تو وہ بھی لیتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ان کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور فیاضانہ سلوک کرتا اور انھیں عمدہ خوراک اور بیئر عطا کرتا تھا۔

چھوٹی روشن آنکھوں، گھنی بھنوؤں اور خمیدہ ناک والا تھتمس مصر کا سب سے

بڑا جرنیل اور مدبّر تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ ان چند فراعنہ میں سے ایک ہے جو علوم وفنون کی سرپرستی اور اپنی تعمیروں کے باعث سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ دولت کی بہترین، ہستیوں کی ہیئت، بے شمار دولت، سونے و تانبے کی کانوں اور عسکری و سیاسی کامرانیوں کی بدولت جو قوت وحشمت اُسے میسّر آئی وہ دنیا کے معدودے چند فرمانرواؤں کو نصیب ہو سکی ہے۔

وزیر کے فرائض اور عدل وانصاف کے متعلق توتمس کے نظریات کا اندازہ اس تقریر سے کیا جا سکتا ہے۔ رخمارا کو وزیر کہتے وقت وہ اس سے مخاطب ہے:

"اپنی عدالت اور دفتروں کے جملہ امور کی مکمل نگہداشت رکھ۔ پورے ملک اور رعایا کی امیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔ تیرا ہر قدم راست اور قانون کے مطابق ہونا چاہیئے۔۔۔۔ جانبداری نہایت گھناؤنا فعل ہے۔ ان باتوں پر سختی سے عمل کر۔ شناسا اور غیر شناسا، قرابت دار اور غیر قرابت دار میں کوئی فرق نہ سمجھ۔ فریادی سے کبھی منہ نہ پھیرنا اور سر کو مخاطب کے سامنے اس طرح کبھی بھی مت ہلانا کہ وہ اسے حوصلہ افزائی سمجھے۔ کسی سے بلاوجہ خفگی بھی مناسب نہیں۔ ناراض صرف اس سے ہونا جو تیری خفگی کا فی الواقع مستحق ہو۔۔۔۔ رگوں میں گھل مل مت جانا تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ وہ (وزیر) صرف ایک (معمولی) انسان ہے۔"

چھوٹے چہرے، جھکی پیشانی اور بہت بڑے گنجے سر والا پانچ فٹ پانچ انچ

لمبانونمس تین بیویوں آحمست، حطشپ سط اور نتبوکا شوہر تھا۔۔۔ یادگاروں سے
اس کے صرف ایک بیٹے آسنخوطپ دوم اور نو بیٹیوں (؟)، پتاحوحا، طاآخا، طوئی،
میرت پتاح، پت پوئی، طاختوئی، نضرآمن، سنت حورا اور حتورت آنوکا پتہ چل رہا ہے

اخناتون

(موحد فرعون)

"دیانت و صداقت، سادگی و اخلاص کا پُتلا —
وہ انسانیت نواز اور مفکر فرعون، عملاً بتلا گیا ہے کہ
شوہر کیا ہوتا ہے، باپ کے فرائض کیا ہیں، دیوتا
کو کیا لازم ہے، شاعر کو کیا محسوس کرنا چاہیئے،
مصلح کیا سکھلاتا ہے، فن کار کی راہیں کونسی ہیں؛
سائنس دان کا کیا عقیدہ ہونا چاہیئے اور —
ایک فلاسفر کا اندازِ فکر کیا ہوتا ہے اور یہ سب
کچھ اس نے تخت پر بیٹھ کر کیا، ایسے ملک کے
تخت پر جو دُنیا کا سب سے طاقتور ملک تھا۔"

آرتھر ویگل

اخناتون (موحد فرعون)

ملکہ نفرتتی (متعلقہ اخناتون)

ملکہ نفرتتی

اخناتون
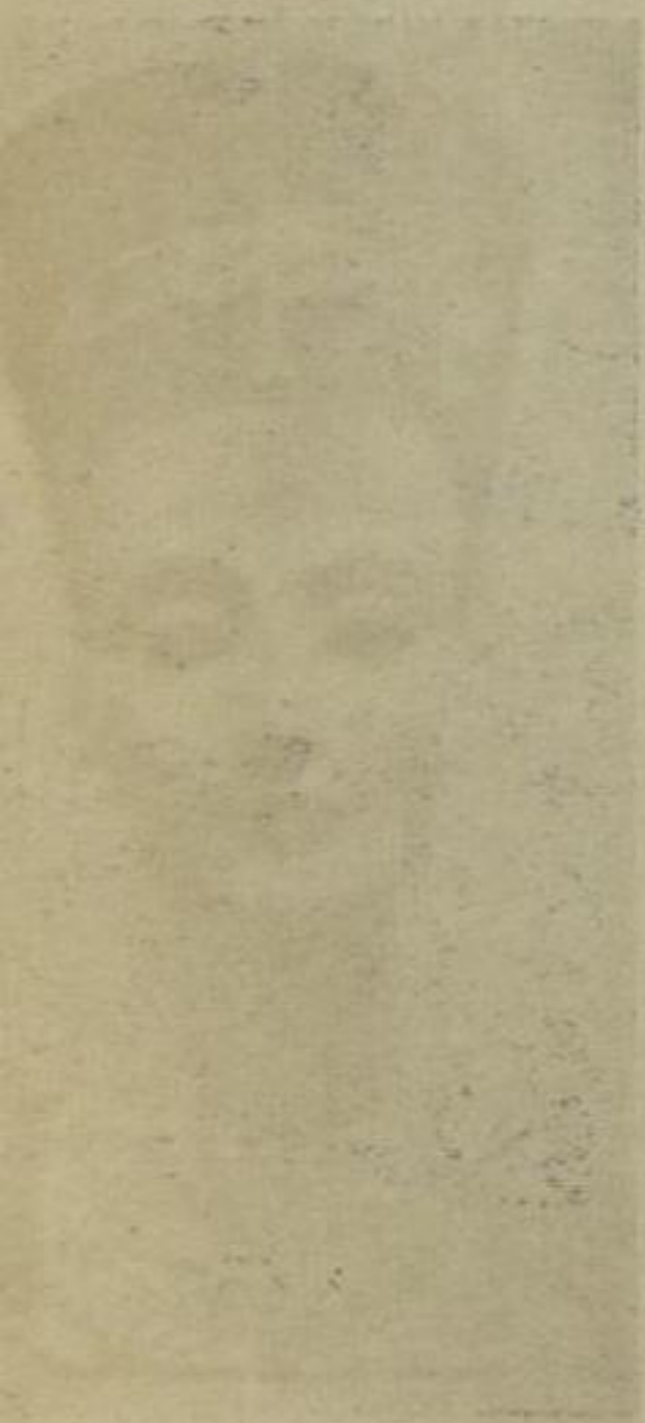
فرعون کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں ایک جابر اور متکبّر کردار اُبھر آیا کرتا ہے۔ دراصل کچھ فراعنہ سے ایسی روایات وابستہ ہو چکی ہیں کہ ہم اپنی لاعلمی کی بنا پر ان کا اطلاق ہر فرعون پر کر بیٹھتے ہیں، حالانکہ متعدد فرعون بہت ہی نیک اور مثالی کردار کا نمونہ تھے۔

بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے کوئی اسّی برس پہلے ایک ایسا فرعون بھی ہو گزرا ہے، جسے تاریخ انسانی کے اوّلین نامور مفکّر اور شاعر، توحید کے گرم جوش مبلّغ، امن اور انسانیت کے پجاری اور انٹرنیشنلزم کے سب سے پہلے علم بردار کی حیثیت سے صفِ اوّل کے انسانوں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ کتنی بڑی زیادتی ہے کہ جب بھی مشاہیرِ عالم کی فہرست مرتّب کی جاتی ہے تو کرشن و زرتشت اور کنفیوشس و گوتم کے اس پیشرو کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو ایک ایسے تاریک دور میں شہابِ ثاقب کی طرح اچانک اُبھر کر نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں ڈوب گیا۔ جب کہ پورا مصر اصنام پرستی اور اوہام و شگون کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھا۔ کہنے کو تو اُس نے محض چھبّیس ستائیس برس کی عمر پائی اور صرف سترہ برس

حکومت کی لیکن اس اُونچے انسان کے دورِ حکومت کو تاریخ عالم میں جو اہمیت حاصل ہے وہ دُنیا کے چند ہی حکمرانوں کے ادوار کو نصیب ہو سکی ہے۔

اس موحد فرعون اخناتون کے مذہبی انقلاب اور تفصیلی ذکر سے پہلے پس منظر کو دیکھ لینا از بس ضروری ہے۔ ابتدائی زمانوں میں مصری مظاہرِ فطرت کو پوجتا تھا لیکن جب آمریت یا شہنشاہیت کا دَور شروع ہُوا تو فرعون کی با اثر اور مقتدر شخصیت کا اثر مذہب پر بھی پڑا۔ چنانچہ سادہ لوح مصری کو گمان گزُرا کہ فرعون کی ارضی حکومت کی طرح آسمانوں میں دیوتاؤں کی بھی سلطنت موجود ہے اور اُس نے یہ عقیدہ بنا لیا کہ معبودِ اعظم "را" یعنی سُورج دیوتا باقی سب دیوتاؤں پر اسی طرح حکومت کر رہا ہے جس طرح کہ فرعون زمینوں میں انسانوں پر۔۔ اور جب فرعون کی قوّت باہر بھی مسلّم ہو گئی تو اس کی ذات سے الوہی نظریئے منسوب کیئے جانے لگے اور وہ "را" یعنی سُورج دیوتا کا ارضی خلیفہ یا بیٹا، قرار دیا گیا۔ تومتش سوم کی فتوحات کے بعد سے تو یہ عقیدہ اور مضبوط ہو گیا۔

اس انقلابی فرعون اخناتون کے آغازِ حکومت میں مصر دُنیا کی سب سے بڑی پاپائیت کے پنجے میں گرفتار تھا۔ یہ پجاری خصوصاً آمن کے کاہن کو اس قدر با اقتدار تھے کہ فرعونِ وقت بھی کسی حالت میں ان سے ذرا سی بھی پرخاش مول لینے کو تیار نہ تھا۔ لاتعداد دیوی دیوتا مصریوں پر مسلّط تھے۔ جن میں۔۔

آمن، آرسس (دیوی)۔ اوزیریس، را، خمنو، فتاح، تھم، موت، نفیرہ
بست، نت، حورس، ست، نفتیس (دیوی) انوبیس، منتو، توت،
نبک، ہاتور (دیوی) جابی، ابیس، خلشو، منتو، سخ مت (دیوی)
اور مات قابل ذکر ہیں۔

آمن چوں کہ شاہانِ وقت اور دارالحکومت ثیبہ (تھبیس) والوں کا خدا تھا اس لئے اُسے معبودِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی۔

ان مذہبی حالات کے علاوہ مصری، اب ایشیائیوں، خصوصاً سامیوں سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ کیونکہ توتمس سوم کے حملوں کی وجہ سے یہ لوگ اتنی تعداد میں مصر آئے کہ مصریوں کا زندگی کے ہر گوشے میں ان سے اثر قبول کر لینا ناگزیر تھا اور اب تو فرعون بھی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ایشیائی شاہزادیوں سے شادیاں کرنے لگے تھے۔ ایشیائی شاہزادیاں یعنی گل خیپا، تھرتی، تادیخیبا مت ایلیا اور دیگر متعدد بابلی اور شامی لڑکیاں، توتمس چہارم، امنوطپ سوم اور اخناتون وغیرہ کے حرموں میں آئیں، نہ صرف خود آئیں بلکہ اپنے ساتھ بے شمار لوگ لائیں۔ چنانچہ صرف گل خیپا ہی تین سو سترہ[۳۱۷] کنیزوں کے جلو میں آئی تھی۔ گویا اس طرح مصر کے شاہی خاندان کے اذہان پر سامی اور آریائی مذاہب کا کچھ نہ کچھ اثر پڑ چکا تھا۔

بچپن اور آغوشِ فطرت

۱۳۹۳ سنہ ق۔م میں اٹھارھویں خاندان کے نویں فرعون آمنوطپ سوم کے

ہاں ایک بچہ پیدا ہوا، کچھ عجیب سا۔ نومولود کا نام آمنحوطپ (یعنی آمن کا اطمینان و سکون) رکھا گیا۔ ننھے آمنحوطپ کی ماں طئی اس دور کا ایک نہایت اہم کردار ہے اور مصر کو اس پائے کی ملکہ بھی کم ہی نصیب ہوئی ہے۔ شاہزادہ شروع سے ہی نحیف و نزار اور بے ڈول تھا اور اسے مرگی کے دورے پڑا کرتے تھے۔ ماں باپ اکلوتے بیٹے کی جسمانی ساخت اور صحت پر دن رات کڑھتے اور اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔۔ شروع سے ہی وہ اتنا سلیم الطبع تھا کہ والدین اور بہنوں کے ضرورت سے زائد لاڈ پیار کے باوجود اس نے کوئی غلط قسم کا اثر قبول نہیں کیا۔

جس محل میں اس نے آنکھیں کھولیں اور جہاں وہ پلا بڑھا وہ دنیا کے چند خوبصورت ترین محلات میں سے تھا۔ گویا بچپن سے اس کے ذہن پر فطرت کے حسین مناظر مرتسم ہو رہے تھے۔ اپنی اعصابی کمزوری اور بے ڈھنگے جسم کی وجہ سے وہ ابتدائے شعور سے ہی ملول رہتا تھا۔ مسرت کا متلاشی کمسن فرعون زادہ ہر وقت کی یہ ذہنی کوفت مٹانے کو مہکتے چمن زاروں میں گھنٹوں پرندوں کے نغمے سنتا، تالاب میں مچھلیاں تیرتے دیکھتا، یا پھر سردیوں کی دھوپ میں تتلیوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک جاتا تو اپنی ننھی منی ہڈیوں

۱؎ یہ شاہزادہ پہلا بچہ نہ تھا بلکہ اس سے پہلے کئی لڑکیاں موجود تھیں اور ایک لڑکا پیدا ہو کر مر چکا تھا۔ البتہ بیٹا اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

اور منحنی جسم کو لیئے دھوپ میں پڑا رہتا محل میں لوٹتا تو بھی دیواروں، کمروں اور غلام گردشوں میں فطری منظر کشی کے شاہکار ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتے — اس طرح اس کی ذہنی کوفت تو کم ہوئی یا نہیں۔ البتہ اس تنہائی پسند نوخیز شاہزادے کے سامنے فطرت جو یوں ہمہ وقت بے نقاب رہنے لگی، تو اس کا چھوٹا سا لیکن غیر معمولی ذہین دماغ فلسفیانہ اور لطیف جذبات کی آماجگاہ بنتا گیا! اور اس کی پاکیزہ روح مصر کے ان گنت خود ساختہ خداؤں سے بھٹک کر خالق حقیقی کی تلاش میں بے چین رہنے لگی۔

ماں کی تربیت اور شادی

اور ماں تشنہ کام بیٹے کے مضطرب ذہن کو اپنے طور پر، توحید کی مبہم سی راہ دکھاتی رہی۔ یہ تو ظاہر ہے۔ طیؔ زادے نے آگے چل کر جو مذہبی انقلاب بپا کیا تو یقیناً وہ بچپن سے ہی کسی ایسی شخصیت سے متاثر رہا ہوگا۔ جو اس کے قریب ترین ہوگی۔ جہاں تک انقلابی شاہزادے کے بزرگوں کا تعلق ہے وہ آمن کے پجاری تھے۔ تاریخ سے کسی اور خاتون کا پتہ نہیں چلتا جس کی گود میں اُس نے تربیت پائی ہو۔ اب لے دے کے بات اُس کی ماں پر آن رکتی ہے اور یقیناً وہ گود جس نے اس کے خیالات کو نئی ڈگر پہ ڈالا۔ اس کی غیر ملکی ماں کی ہی ہوسکتی تھی۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ طیؔ کے متعلق ذرا تفصیلی حالات بیان کر دئے جائیں کیونکہ اس حیرت انگیز فرعون کے ذہنی انقلاب میں اس کا بہت بڑا

حصہ ہے۔ اس ملکہ کے متعلق مورخین میں بہت اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ مصر ہی کے ایک ادنے خاندان کی بیٹی تھی اور اس کا یہ خاندان ان قبائل میں سے تھا جو نیل اور بحیرہ قلزم کے درمیان آوارہ گردی کرتے رہتے تھے۔ رعنائی و جاذبیت کی بنا پر ملکہ بنی اور پھر اپنی محبوبیت کے سہارے اس قدر وقار حاصل کر لیا جو ایک فرعون زادی ہی حاصل کر سکتی تھی (اگرچہ بعد میں شوہر آمنحوطپ سوم نے "متانی" کی شہزادی گل خیپا سے بھی شادی کر لی تھی، لیکن وہ طئی کے محبوب اثرات اپنے ذہن سے ذرا کم نہ کر سکا) بعض کہتے ہیں کہ یہ مصر کے قدیم دیوتا آمن کے مندر کی پجاری کی بیٹی تھی، خاوند کے ساتھ محلات شاہی میں کھیلی کودی اور دونوں شادی سے پہلے ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے تھے۔ دس سال کی عمر میں اس کی شادی بارہ سالہ آمنحوطپ سوم سے ہوئی۔ چند ایک کے خیال میں وہ توتمس سوم کی نسل سے[1] ہی تھی، لیکن عام نظریہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف ایشیائی بلکہ سامی النسل تھی اور ہمارے خیال میں صحیح بھی یہی ہے۔ اس کے ماں باپ کا نام طوآ اور یویا تھا۔ طئی اور اس کے لواحقین کو نیک دل آمنحوطپ سوم نے مکمل مذہبی آزادی دے رکھی تھی اور وہ اپنی جملہ رسوم اور تقاریب بڑی شان و شوکت سے مناتی تھی۔ آمنحوطپ

---

[1] اور ایسے بھی ہیں جو اسے متانی کے شاہی خاندان سے مانتے ہیں اور دلیل اُن کی یہ ہے کہ فرمانروائے متانی دشرتا ایک خط میں اپنے داماد اخناتون کو لکھتا ہے "میری بہن (طئی) اور تیری ماں"۔ لیکن وہ ایسا احتراماً بھی تو لکھ سکتا تھا۔

نے عزیز بیوی کی خاطر ایک میل سے زیادہ لمبا اور ہزار فٹ چوڑا تالاب بنوا دیا تاکہ اس کے خاص تہوار کے دن مذہبی ضروریات اور رسوم پوری ہو سکیں۔

بہرحال اس غیر معمولی طباع اور جدت طراز شاہزادے نے ابتدا ہی سے اپنی ماں طئی سے "خدائے نور" (سورج) کی تعلیم حاصل کی جو اس کے دل و دماغ کو پوری طرح متاثر کر گئی ملکہ دراصل "قرصِ خورشید" کی پجارن تھی۔

پچاس سالہ بوڑھے اور بیمار آمنحوطپ سوم کو بیٹے کی شادی کی بہت فکر تھی۔ بالآخر اس کی نگاہِ انتخاب متانی[1] کے آریائی حکمران وشرتا کی بیٹی تادوخیپا پر پڑی۔ چنانچہ اس نے وشرتا سے بہو طلب کی۔ وشرتا نے لڑکی فوراً روانہ کر دی۔ دلہن اس وقت آٹھ نو برس کی تھی وہ اپنی[2] کے جہیز میں مصر پہنچی اور چونکہ بالکل بچہ تھی۔ اس لئے اسے ایک معزز شخص آئی کی بیوی طئے کی زیر تربیت دے دیا گیا۔ چار پانچ سال بعد اس سے پہلی لڑکی پیدا ہوئی۔ مصر آئی تو پہلے اس کا نام نفرتیتی (یعنی جلوہ گر ہونے والی حسینہ) تبدیلیِ مذہب کے بعد خاوند نے اسے آتن نفر نفرو (آتن کی خوشنما

---

[1] یہ ریاست مصر کے شامی مقبوضات اور حتی مملکت اور عراق کے درمیان ایک آزاد آریائی ریاست تھی۔

[2] بارہ تیرہ برس کی عمر میں تادو کا ماں بن جانا کچھ تعجب انگیز نہیں ہے (بقیہ اگلے صفحے پر)

صورت) کا خطاب دیا اور پھر یہ آتن نفرو نفرتی کہلائی۔ اس نئے بیان کے شادیانے ابھی فضاؤں میں گونج ہی رہے تھے کہ مصریوں کو اپنے نیک دل فرعون آمنحوطب سوم کی موت کا چرکا سہنا پڑا۔

مسندِ حکومت پر

شاہزادہ آٹھ نو برس کا تھا کہ باپ نے اپنی زندگی ہی میں حکومت کے اکتیسویں برس بیٹے کو آمنحوطب چہارم کے نام سے فرعون بنا دیا۔ ننھے فرعون نے حکومت میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ وہ دربار کے گھٹے گھٹے ماحول پر باغوں کی کھلی فضا کو ترجیح دیتا تھا۔

لیکن رعایا اپنے نحیف و ناتوان اور معصوم فرعون سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ خاوند کے مرنے کے بعد طئی نے امور مملکت اپنے ہاتھ میں لے لئے وہ بیٹے کے مزاج میں بے حد دخیل تھی اور فرعون کی سرپرست ہونے کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک اسے مکمل اقتدار حاصل رہا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) آج بھی مصری لڑکیاں تیرہ بلکہ بعض تو اس سے بھی پہلے ماں بن بیٹھتی ہیں اور پھر یہ تولیدی سلسلہ ہر سال یا دوسرے سال جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ پندرہ پندرہ بچوں کے خاندان وہاں مل جاتے ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے آدھے تو بچپن ہی میں چل بستے ہیں۔

ے اس کے کئی اور بھی خطابات تھے مثلاً اریت نیت خنت نب (یعنی شاہزادی النساء) اور شمال و جنوب شاہزادی، اور تیسرا تھا خاتونِ مصر۔ مارگریٹ مرے کے خیال میں چھ لڑکیوں کے پیدا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اعلانِ توحید

پندرہ سال کی عمر کو پہنچ کر مروجہ مذاہب کے پیدا کردہ ہر قسم کے ذہنی خلفشار سے گزر کر وہ ایک خاص فیصلہ پہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے 'آمن' اور اس کے بدمزاج اور نشۂ قتدار میں بدمست پجاریوں کی قوّت کو ٹھکراتے ہوئے 'آتن' کے سرکاری خدا ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنا نام آمنحوطپ سے بدل کر اخناتون (آخن آتن) رکھ لیا۔ اخناتون یا آخن آتن کے معنی ہیں 'آتن کا جلال یا آتن کا مقرب بندہ۔

تجسیم خداوندی سے متعلق اس نے تمام مصری نظریئے ٹھکرا دیئے اور ایک اَن دیکھے خدا کا نظریہ پیش کر دیا اور اپنے اس ایک خدا کی تبلیغ کے لئے اُس نے تمام تر مخلصانہ کوششیں وقف کر دیں۔ آمن کی پوجا اور اُس کے اثرات کا اُس نے خاص طور پر بڑی سختی سے خاتمہ کرنا چاہا۔ اس دیوتا کے پجاریوں کے تمام اختیارات، وسائل اور اوقاف و وظائف ضبط کر لئے۔ دراصل ان لوگوں کی غلط کاریوں سے وہ سخت متنفر تھا۔ اپنے بزرگوں کے ناموں سے بھی آمن کا لفظ کھرچوا ڈالا۔ حد یہ ہے کہ اس نے ہزارہا سالہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۲) ہونے کے بعد نفرتتی، اخناتون سے علیحدہ ہو گئی اور 'آخت آتن' کے دوسرے حصے میں رہتی تھی، یا نظر بند کر دی گئی تھی اور وجہ اس کی مارگریٹ یہ دیتی ہیں کہ اولادِ نرینہ نہ ہونے کے باعث اخناتون نے ایک لڑکے کو شریکِ حکومت کر لیا تھا اور ملکہ کو دکھ یہ تھا کہ اس کی جگہ اخناتون کی زندگی میں ہی غصب کر لی گئی ہے

قدیم دیوتا اوزیرس کو بھی نہیں چھوڑا۔ مصر کی طویل تاریخ میں مصریوں کے اس محبوب ترین اوزیرس کی پوزیشن کو ایک بار چیلنج کیا گیا اور یہ چیلنج کرنے والا تھا اخناتون۔ اسی پر بس نہیں بلکہ 'خداؤں' کے لئے جو مصری لفظ 'نترو' (بصیغہ جمع) تھا اُسے بھی مسخ کرا دیا۔

ثیبہ میں دو مندروں کے درمیان اس نے اپنے خدا کے لئے ایک معبد بنوایا جو 'جم آتن ام پرتن' کہلاتا تھا۔

دارالحکومت کی تبدیلی

ثیبہ کے پجاری طبقے کی سرگرمیوں کی وجہ سے اسنخوطپ سوم کے زمانے سے برانگیختہ چلے آرہے تھے۔ اب ان میں تابِ صبر نہ رہی اور اعلانیہ بغاوت کر بیٹھے، مگر اخناتون کے ہم زلف اور قابل سپہ سالار حورم حب نے ان کے حواس درست کر دیئے لیکن اب اخناتون بھی ثیبہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے موجودہ قاہرہ سے کوئی ۱۶۰ میل پرے دارالحکومت کی تعمیر کا حکم دے دیا۔ نیا صدر مقام انجینئرنگ پلان کے مطابق نیل کے کنارے بستا چلا گیا تھا۔ بڑا ہی خوبصورت اور صاف ستھرا شہر تھا۔ سڑکوں کے دونوں جانب سایہ دار

---

[1] اوزیرس آخرت کا دیوتا تھا اور آسمان اس کی قلمرو تھی۔ یوم آخر میں وہی حساب کتاب لیتا تھا۔ نجات دہندہ اور منتظم جنت بھی وہی تھا۔ دراصل یہ عراق کا تموز تھا جو وہاں سے ایک خیال کے مطابق آٹھ ہزار قبل مسیح میں لایا گیا تھا۔

درخت لگے تھے۔ عالی شان شاہی محلات، سرکاری عمارتیں اور امرا کے مکان باغوں، تالابوں اور سرہاؤسوں سے گھرے تھے۔ اس نئے شہر کا نام اُس نے "آخت آتن" (بمعنی آتن کے اُفق پہ قائم ہونے والا شہر) رکھا۔ یہ تین اطراف سے چٹانوں اور ایک جانب دریا سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں اُس نے تین عالی شان معبد بنوائے

اس کے یہ پے بہ پے اقدامات بلاشُبہ بے حد جرأت مندانہ مگر ساتھ ہی اس کے اپنے حق میں بڑے خطرناک بھی تھے۔ آمن کی معزولی اور پاوریوں سے ٹکر لے کر اس نے دُنیا کی سب سے زیادہ بااختیار اور عظیم پاپائیت کو چیلنج کیا تھا، اور اس پہ طرّہ دارالحکومت کی تبدیلی۔ مصر قدیم میں ہر شہر و دیوتا کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ان میں سے اگر کسی ایک پہ زد پڑتی تو اسے دوسرے پر بھی حملہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ ثیبہ اور ممفس پہ ہی منحصر نہیں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے لوگ بھی اپنے دیوتا کی خاطر کسی بھی طاقت سے ٹکرانے پہ آمادہ رہتے تھے اور چونکہ ثیبہ اس وقت مصر کا دارالحکومت تھا اور آمن مرکزی دیوتا۔ اس لئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخناتون کے اس طرزِ عمل سے عوام اور خصوصاً پجاریوں کے دلوں میں کس قدر تنفّر اور انتقامانہ جذبات بھڑک اُٹھے ہوں گے۔

دارالحکومت کی تبدیلی گویا آمن پہ ایک اور شدید چوٹ تھی۔ ایسی کہ وہ کم از کم اخناتون کی زندگی میں تو اس وار سے سنبھل نہ سکا۔ دراصل اخناتون

اس حقیقت کو بھانپ چکا تھا کہ ملک سے موجودہ توہمات اور غلط مذہب کے استیصال کے ساتھ ساتھ جب تک پجاریوں کی قوت کا طلسم اور عظیم معبود "آمن" کا زور نہ توڑا گیا اس وقت تک توحید اور جدید مذہب کی ترویج ناممکن ہے۔

بہرصورت اٹھارہ انیس برس کی عمر میں یہ عظیم مصلح، سینے میں سچائی کی تڑپ لیئے عزم و استقلال کی تصویر بنا، محبوب بیوی نفرتیتی، تین ننھی بچیوں اور اپنی سلیج نیز متت کی معیت میں آخت آتن روانہ ہوا۔ اراکین دربار بھی اس دریائی سفر میں اپنے نوعمر بادشاہ کے ساتھ تھے۔ آج کل "آخت آتن" "تل الامرنہ" کے نام سے مشہور ہے۔

اُس کا مذہب

طی کے عقائد کو ہم "موحدانہ" نہیں کہہ سکتے۔ ماں نے بیٹے کو "آفتاب پرستی" کی طرف لگانا چاہا۔ لیکن بیٹا اس سے بھی آگے نکل گیا۔ اس کا مضطرب ذہن اپنی منزل کو پہنچ چکا تھا چنانچہ اس کا ذہن اس "مادی خدا آفتاب" کا پابند نہ ہو سکا۔ اس نے سورج کو تو خدائے برحق کا محض ایک عظیم جلوہ سمجھا۔ اور پھر اُسے ہر طرف خدا نظر آنے لگا۔ فضاؤں میں، مرغزاروں میں، پانیوں میں، پرندوں کی تانوں اور اڑانوں میں ــــ ماں کا مذہب قریب قریب مظاہر پرستی تھا۔ لیکن یہ مذہب اپنی مکمل اور صحیح شکل کو تو دراصل اس کے نوخیز مگر فہیم و عقیل بیٹے کی موحدانہ، فلسفیانہ تعلیمات۔ اور سائنٹفک نظریات سے پہنچا۔

غرض تینتیس ۳۳ صدیاں قبل دُنیا کے اوّلین مفکر و سائنس داں نے ایک ترقی یافتہ فلسفیانہ، سائنٹفک اور انتہائی سادہ مذہب کی بنیاد ڈالی ۔ فلنڈرس پیٹری کے الفاظ میں :

"جہاں تک ہمیں معلوم ہے دُنیا میں اس سے قبل الٰہیات کے متعلق ایسا عظیم اور سائنٹفک نظریہ پیش نہیں کیا گیا - اور یہ بجا طور پر بعد میں آنے والے توحیدی مذاہب کا پیشرو تھا ۔ فطرت اور مظاہر پرستی کی جتنی بھی اقسام ہیں - اخناتون کا مذہب ان سب سے بڑھ کر فطرت کے نزدیک اور حقیقت پسندانہ تھا - اگر یہ جدید مذہب ہمارے آج کے سائنسی نظریوں اور انکشافات کی تقویت کے لئے ایجاد ہوا تھا تو فی الحقیقت شمسی توانائی سے متعلقہ اخناتون کے اس نظریہ میں ہم کوئی نقص نہیں نکال سکتے - اور یہ موحد فرعون اپنے نظریوں میں اس حد تک آگے جاچکا تھا کہ اس وقت کم از کم منطقی طور پر تو اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا - آغازِ تاریخ سے موجودہ صدی تک کسی ایسے فلاسفر سے بھی ہم واقف نہیں ہیں جو اس کے مذہب کی اس بنیادی حقیقت کو سمجھ پایا ہو کہ آفتاب کی قوت و عمل کا انحصار شعاعوں پر ہے اور کائنات کی توانائی اور سرچشمہ حیات یہی کرنیں ہیں ۔ سائنس نے بھی اب کہیں جاکر (نوری توانائی) کے ان اصولوں سے روشناس کرایا ہے جو اخناتون کے مذہب کی اٹل بنیادی خصوصیات تھیں ۔

کوئی تصور بھی تو ایسا نہ تھا جو اخناتون کے نظریہ کی ٹکر لے سکتا کیونکہ سائنسی انکشافات تو کم از کم تین ہزار برس بعد آنے والے تھے —"

وہ "تجسیم خداوندی" کے تمام نظریئے بڑی جرات سے ٹھکرا کر ہر قسم کے مادی خواص سے مبرا خدا پر ایمان لے آیا اور اسے زمان و مکان کی قید سے بالاتر سمجھا۔ اس کا خدا انسانوں کا تخلیق شدہ نہ تھا۔ وہ مادی قیود اور خواہشات سے آلودہ نہ تھا۔ وہ کسی خاص شہر، فرقے یا قوم سے بھی مخصوص نہ تھا۔ اس کا جسم انسانی اور حیوانی اعضاء سے مرکب نہ تھا جیسے کہ مصری ابوالہول۔ نہ وہ کوئی ایسا خدا تھا جس کی آمد و رفت زمین پہ مہابھارت کے کرشن اور موجودہ بائبل کے خداوند کی طرح جاری رہتی ہو اور انسانوں سے کشتیاں لڑتا پھرتا ہو۔

وہ تو ان سب چیزوں سے بالاتر اور رب العٰلمین تھا۔ اس کا خدا آفرینش کائنات سے پہلے بھی لاشریک اور تنہا تھا اور اب بھی ہے۔ تخلیق کائنات سے پہلے بھی خدا کے وحدہٗ لاشریک ہونے کا یہ نظریہ اس کے مذہب کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو سوائے قرآن کے اور کسی الہامی کتاب میں نہیں ملتی — وہ ایسی خفیہ قوت تھی جس نے سورج پیدا کر کے آفرینش اور بقائے حیات کی قوت تفویض کر دی۔ یہی سورج اس کے فیض کا سب سے بڑا

ظاہری منبع تھا اور اسی کے ذریعے اس کی رحمتیں دنیا پر برابر جاری و ساری تھیں۔ اس غیبیہ قوت کو وہ سورج کا آقا بھی کہتا تھا اور آتن بھی۔ مصر کے ہیرو گلیف رسم الخط میں آتن اس طرح لکھا جاتا تھا "𓇳𓏏𓈖" ۔ ویسے سورج بھی آتن کہلاتا تھا۔

اسرائیلیوں کو فخر رہا ہے کہ خداوند، صرف اور صرف ان کا تھا اور وہ اس کی برگزیدہ اور منتخب شدہ قوم۔ لیکن اخناتون کے خدا کے سب بیٹے تھے اور آپس میں بھائی بھائی۔ وہ گورے، کالے، خطاکار اور معصوم، مصری اور غیر مصری میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا تھا۔ انسان تو انسان جانور بھی اس کے لطف و کرم میں برابر کے شریک تھے اور وہ ہر ذی حیات کی ضروریات، بلا کسی امتیاز کے پوری کرتا تھا۔ تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شاہ وقت نے غیر ملکی غلاموں اور ماتحتوں کو اپنی قوم کے دوش بدوش عبادت کے لئے یکجا کر دیا۔

اس شاندار ذہنی پیداوار میں اصنام و توہم پرستی اور تصنع آمیزی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے اپنے خدا آتن کی شبیہ یا مجسمہ بنانے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ نہ کبھی اس کے لئے قربانی دی۔ بہت کیا تو یہ کہ معبدوں میں کبھی تازہ پھول چڑھا دئے جاتے اور بس۔ اس کے مذہب کی علامت تھی "قرص خورشید" جس میں سے کرنیں پھوٹ کر آخر میں ہاتھ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ گویا ہر ذی روح کے لئے صحت اور زندگی کی پیغامبر تھیں۔ لیکن

اس "آفتابی ٹکیہ" کی پوجا نہیں ہوتی تھی اس کی مثال بقول ویگل ایسی ہے جیسے کہ "عیسائیوں کی مذہبی علامت صلیب - لیکن وہ اس کو پوجتے نہیں ہیں" اس کا مذہب اس قدر سادہ، اتنا فطری، ایسا لطیف، سائنٹیفک اور حقیقت پسندانہ تھا کہ عظیم مذاہب عالم کی تاریخ مرتب کرتے وقت اسے نظرانداز کیا ہی نہیں جا سکتا - بقول آرتھر ویگل

"اخناتون کا مذہبی انقلاب ذہنِ انسانی کی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ آج کا سائنس دان خدا کو سرچشمہ حیات قرار دے گا، مادی توضیحات جہاں آن کرنا کام ہو جاتی ہیں، وہاں خدا کی ذات لے آئی جاتی ہے - ایک لفظ میں وہ (خدا) مبدائے حرکت اور (خالق) توانائی ہے ۔ سائنس دان کی پیدائش سے صدیوں پہلے اخناتون نے بالکل انہی خطوط پر نظریہ الوہیت پیش کیا - ایسے وقت، جبکہ لوگ خدا کو مادی سمجھتے تھے، اس نوخیز فرعون نے ایسی علیم اور شفیق ذاتِ مطلق سے روشناس کرایا جو ہر مادی پابندی سے ماورا تھی اور زمان و مکان میں رچی بسی تھی - اس کا خدا ویسا ہی تھا، جیسا ہمارا ہے، اس نے ہر وہ صفت اپنے رب سے منسوب کی جو آج ہم کرتے ہیں ۔ اس سے قبل فکرِ انسانی ایسے معبود کا نظریہ پیش نہیں کر سکی جو مخلوق سے اتنی گہری وابستگی اور شفقت رکھتا ہو

— یہودیوں نے سینکڑوں برس بعد جا کر وہ نظریہ ہمارے سامنے رکھا جو اخناتون (پہلے ہی) اپنے خدا کے متعلق پیش کر چکا تھا — یہ مذہب اس قدر فطری اور اتنا سچا تھا کہ اس میں کوئی کمزور پہلو تلاش کرنے کے لئے اس کا موازنہ ہمیں عیسائیت سے کرنا ہوگا — اندھیری راتوں میں چندھیا دینے والی برقِ تپاں کی طرح (اخناتون) مصر کے تاریک افق پر لمحہ بھر کے لئے کوندا اور پھر اوجھل ہو گیا۔ آنے والی مذہب پرست مغربی دُنیا کے لئے وہ پہلا اشارہ تھا[1]"

اخناتون کے مذہب کے اہم ترین ماخذ امر، کی وہ نظمیں ہیں جو اس نے آتن کی شان میں کہی تھیں۔ یہ مناجاتیں دُنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی ہیں جن میں خدا کی کریم النفسی اور تلطف کا اعتراف اس قدر گہری عقیدت اور جذبے کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ حمدیں 'طل العمرنہ' کے مقبروں سے مل گئی ہیں۔ ان میں ایک کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اس کی طویل ترین مناجات ہے۔ اور اس کے نظریوں کی عکاسی بھی خوب ہوتی ہے :-

---

[1]

(۱)

صبح

کتنا سُہانا اور دل آویز ہے تیرا طلوع،
زندۂ جاویدِ آتش! —— اے منبعِ حیات
مشرقی کونے سے اُبھرتے ہی،
ہر گوشۂ زمین تیرے حُسن سے معمور ہو جاتا ہے

دوپہر

خیرہ کُن تابندگی کے ساتھ،
تو بلندی پہ چمکتا ہے۔
تیری کرنیں زمینوں کا احاطہ کر لیتی ہیں
تو مخلوق کو،
محبت اور شفقت کے بندھنوں میں جکڑ لیتا ہے
تو دُور ہے،
لیکن تیری درخشندگی زمین پہ ہے
تو دُور ہے،
لیکن دن تیرے ساتھ ساتھ رواں ہے

رات

تیرے چھپنے کے بعد،
زمین پر تاریکی اس طرح چھا جاتی ہے،
جیسے موت،
گھروں میں لوگ منہ لپیٹے،
سب کے سب آنکھیں بند کئے سوتے ہیں
اُن کے سرہانوں سے چیزیں اُٹھالی جاتی ہیں
اور اُنھیں خبر تک نہیں ہوتی
شیر کچھاروں سے نکلتے ہیں
سانپ ڈسنا شروع کر دیتے ہیں،
اور تاروں بھری رات دھیرے دھیرے گزرتی چلی جاتی ہے۔
ہر طرف سکوت ہی سکوت
کیوں کہ اے خالق،
تو اس وقت اُفق میں آرام کر رہا ہے۔

۲

آتن کی حکمرانی — روئے زمین پر

تو طلوع ہوا،

اور زمین منوّر ہو گئی

اندھیرا بھاگا،

تو جو روشنی بکھیرتا چلا جاتا ہے،

زمینیں شادکام ہوئیں۔

آدمی

آدمی اٹھے،

تو نے انھیں جگایا

نہا دھو کر تیار ہو جاتے ہیں،

اور ہاتھ اٹھا کر تعظیم کرتے ہیں۔

پھر وہ مصروفِ کار ہو جاتے ہیں۔

جانور

مویشی سبزہ زاروں کو چلے،

طیور مائلِ پرواز ہوئے
ان کے پَر تری ثنا میں مصروف ہیں
جانور زقندیں بھرنے لگے
تجھ ہی سے، زندگی پاتے ہیں

پانی

مانجھی کشتیاں کھینے لگے،
ہر راہ تیرے نُور سے جگمگا اٹھی
مچھلیاں تیرے گیت گاتی تیرنے لگیں
تیری کرنیں پانیوں کو چیر گئیں۔

(۴)
"آتن — منبعِ زندگی"

انسان

تو رحمِ مادر میں،
بیضۂ انسانی ڈالتا ہے
اور ماں کے پیٹ میں
بچّے کو زندگی بخشتا ہے

تُو نے اُسے وہاں سکون دیا
کہ مضطرب و خائف نہ ہو،
اور جب وہ اس دُنیا میں آتا ہے
تو اس کا مُنہ کھول دیتا ہے۔
بولنے کے لئے
اور اس کی ضروریات پُوری کرتا ہے

جانور

انڈے میں ننھا بچّہ،
تُو نے پیدا کیا اور حیات بخشی
وہ بزور انڈے سے باہر نکل آتا ہے
پُوری طاقت سے چِلّاتا ہے،
اور پھر دوڑنے لگتا ہے۔

(۴)

آتن، ربّ العٰلمین ہے

کتنی ہی چیزیں تُو نے بنائیں،
زمینیں پیدا کیں،

تُو واحد ہے اے میرے معبُود

انسان اور حیوان،

زمین پر چلنے والی ہر شے،

فضاؤں میں تیرنے والے پرند،

تُو ہی سب کا خالق ہے

شام اور کش کی پہاڑیوں میں

اور مصر کے میدانوں میں،

تُو نے ہر ایک بسایا۔ سب کو حیات بخشی،

ہر ایک کو ضروریاتِ زندگی دیں۔

ان کی زبانیں مختلف،

ان کی فطرت جُدا،

ان کا رنگ روپ الگ،

یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہی تو ہے۔

(۵)

آتن زمین کو سیراب کرتا ہے

تُو نے زمین کے نیچے نیل پیدا کیا

اور پھر اپنی مرضی سے اسے جاری کیا،

کہ لوگ اس سے فیض یاب ہوں۔
تُو ہر حال میں سب کا پالنہار ہے
گناہگاروں کا ــــ خطاکاروں کا

اے دُنیا کے مالک تو ان سب کے لئے ہے
ہر ملک کے لوگ، تیری تعظیم کرتے ہیں
تُو ان کو پالتا ہے،
تُو نے آسمان میں 'نیل' پیدا کیا
کہ ان پہ بارش برسائے،

اور پہاڑوں پہ برسے،
بحرِ ذخّار کے مانند
ان کے کھیتوں کو سیراب کرے
تیرے جلوے بھی کیسے ہیں
اے ابدیّت کے مالک،
آسمانوں کا نیل دوسرے لوگوں کے لئے ہے،
اور تمام جنگلی درندوں کے لئے بھی
مگر (مصری) نیل مصریوں کا ہے۔

(۶)

آتن موسم پیدا کرتا ہے

تُو نے سال کے موسم بنائے
کہ تیرے کرشمے ظہور میں آئیں
سردی اور گرمی
بعید ترین اُفق تُو نے بنایا،
کہ 'تو' وہاں اُبھرے۔
سب کچھ تُو نے پیدا کیا،

جب تُو اکیلا تھا

اُس نے جو مذہبی قواعد و ضوابط اور وظائف وغیرہ مرتب کیے۔ بائبل کی بہت سی آیات ان سے بے حد مشابہت رکھتی ہیں۔ دُنیا کا کوئی اور مذہب عیسائیت سے زیادہ 'آتن ازم' کے قریب نہیں ہے اور 'ویگل' وغیرہ کے خیال میں اخناتون کا مذہب عیسائیت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ موجودہ زبور ۱۰۴ کی ۱۹ سے لے کر ۳۰ تک کی آیات اخناتون کی نظم سے بے حد مشابہ ہیں۔ اس غیر معمولی مشابہت کے پیشِ نظر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ دونوں میں براہِ راست تعلق ہے اور یہ حمد جو آج کل حضرات

داؤد سے منسوب کی جا رہی ہے۔ یہ ان اسرائیلی علماء نے اخناتون کی
نظم سے اخذ کر کے قلم بند کی جو فرعون کی حمد سے آشنا تھے چنانچہ تخیل
تخیل، اندازِ بیان اور اکثر الفاظ تک، وہی ہیں ۔۔۔

اخناتون نے چاہا تھا کہ لوگوں کی زندگی حسن و خوبی کا مرقع ہو۔ و
نیکی کے جویا ہوں اور ہر بری حرکت سے گریزاں۔ کردار کا عمدہ نمونہ پیش کر
دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنیں۔ بقول بعض اُسے اپنی تمام نظموں میں سچا
پر اتنا زور دیا ہے کہ اس سے پہلے یا بعد میں کبھی نہیں دیا گیا" ۔۔۔ اس
ایمان تھا کہ یہ دُنیا جنت بن سکتی ہے۔ اگر لوگ اس کے عقائد اور اصولوں
کاربند ہو جائیں۔ اس کے پیروکاروں کو بھی یقین تھا کہ "اخناتون کی تعلیما
اس وقت تک برقرار رہیں گی جب تک کوا سفید اور ہنس سیاہ نہ ہو جا
پانی پہاڑوں پہ نہ چڑھ جائے اور پہاڑ اُٹھ کر چلنا شروع نہ کر دیں۔"

اُس نے عبادت کے لئے یہ اوقات مقرر کئے۔ "طلوعِ آفتاب کا
وقت" اور "غروبِ آفتاب کا وقت" ۔۔۔ عام مصری عقیدے کے برعکس
اخناتون صرف روح کی ابدیت کا قائل تھا، جسم کی لافانیت اور اس کی
حیاتِ نو کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ وہ اس خیال سے ہی متفق تھا کہ جسم یا
روح کو بعد از مرگ بھی قبروں میں لوازمِ زندگی کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے
اُس کے ہاں فی الحال دوزخ کے متعلق کوئی نظریہ نہیں ملتا۔

بعض کے خیال میں اخناتون کا آتن دراصل شامی آدن تھا۔ آد

کے معنی باپ، یا آقا کے ہیں اور جب یہ نام مصر آیا تو لب ولہجہ کے قدرتی اختلاف کے باعث ' آتن ' بن گیا۔ اور بعضوں کے خیال میں اس کا مذہب مصر قدیم کی آفتاب پرستی اور کچھ آریائی تصورات سے متاثر تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائً اخناتون کے ذہن نے غیر ملکی تاثرات قبول کئے تھے۔ لیکن شامی اور ایشیائی اثر جزوی تھا محض اتنا کہ وہ مصری مذاہب سے باغی ہو کر ایک نئے دین کی ضرورت محسوس کر چکا تھا۔ اس کے مذہب کی جو شکل ہمارے سامنے ہے وہ یقیناً اس کی اپنی ذہنی قوتوں کی تشکیل تھی مصری عراقی، اور شامی یا آریائی اپنے ' خدا ' سے اس قدر سائنٹفک، حقیقت پسندانہ اور موحدانہ نظریات کبھی بھی منسوب نہ کر سکے اور نہ اخناتون جیسی ارفع تعلیمات دنیا کے سامنے رکھ سکے۔ پھر اخناتون کا خدا، ایشیائی اور دیگر مصری ارباب عظیم کی طرح مختلف دیوتاؤں کے گروہ کا سربراہ نہیں تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے صرف اور صرف ایک خدا تھا۔

اس کی شخصیت

سترہ برس کی حکومت کے بعد اس کی صحت جواب دے گئی۔ آخری ایام بڑے ہی المناک اور کرب انگیز تھے۔ تفکرات اسے کھائے جا رہے تھے اور بیماری اس پر مستزاد تھی۔ اسے خود احساس تھا کہ وہ اپنے ارفع اور پاکیزہ مشن میں ناکام

رہا ہے۔ اسے بیمار اور موت کے چنگل میں پھنستا دیکھ کر سب سردار اور امرا
اس سے برگشتہ ہونے کی فکر میں تھے۔ غریب فرعون اپنی تمام تر نوازشات
کے باوجود ابن الوقت امراء کا خلوص نہ جیت سکا تھا۔ صرف اس کی وفادار
اور محبوب بیوی تھی جو چھ بچیوں سمیت بیمار، مایوس اور دلگیر شوہر کی آخر وقت
تک غم گسار و دمساز رہی۔

بالآخر یہ نوعمر لیکن تاریخ کا عظیم اور حیرت ناک انسان محض چھبیس ستائیس
برس کی عمر میں مرگی کے شدید حملے کے باعث تئیس سالہ بیوی اور چھ کمسن
بچیوں کو بلکتا چھوڑ کر چل دیا[1]۔

اس بے پناہ قوتِ کردار کے حامل انسان کو لوگوں نے مختلف ناموں
سے پکارا ہے۔ بریسٹڈ کی رائے میں وہ "اولین پیغامبر اور تاریخ کی سب
سے پہلی شخصیت[2] تھی"۔ ویگل اسے "حضرت مسیح سے پہلے سب سے
بڑی ہستی" قرار دے رہا ہے اور ڈیچ "سب سے پہلا موحد[3]" کہتا ہے

[1] اخناتون کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی البتہ قدرت نے سات بیٹیاں بخش دی
تھیں۔ جن کے نام یہ ہیں: میاتن، میکاتن، آنخ سینپا آتن، نفر آتن، نفر
سیتوپن را، اور ستپاتن۔ میکاتن باپ کی زندگی ہی میں مرگئی تھی۔

[2]

[3]

بعض علماء کے خیال ہیں :

"وہ پہلا شخص ہے جس نے الٰہیات کو صحیح طریق پر سمجھا اور ان انقلاب انگیز مشاہیر میں وہ سب سے پہلا انقلابی ہے، جس نے ماضی کے بے مغز اور لایعنی عقائد و نظریات سے کھُلم کھُلا بغاوت کی

وہ اوّلین انسان ہے جس نے "امن" کا پرچار کیا اور اس کی موت کے ساتھ ایسی روح بھی ختم ہو گئی۔ جیسی اس سے پہلے دُنیا میں کبھی نہ آئی تھی۔[1]

بعض مورخین نے اسے نیم پاگل، خود پسند، لہو و لعب کا عاشق اور حُسن پرست جیسے القاب سے نوازا ہے۔[2] وہ حُسن پرست تھا یا کچھ اور۔ یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ بدرجہ غائت نڈر، سنجیدہ اور مخلص انسان تھا، جو ایک اہم مقصد لے کر آیا اور ہزارہا سالہ قدیم اور مضبوط روایات کی زنجیریں پاش پاش

---

[1] مشکل یہ ہے کہ یہ علماء جو اپنے نظریئے کے مطابق بجا طور پر اسے یہ اعزاز دے رہے ہیں حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ اور اخناتون سے پہلے کے دیگر پیغمبرانِ عظام کی صحیح شخصیت سمجھ نہیں سکے ہیں اور اس میں انکا اتنا قصور بھی نہیں ہے۔ موجودہ بائبل پیغمبرانِ کرام کی حقیقی اور مؤثر کیفیت پیش کرتی نہیں اور محققینِ یورپ، کی نگاہیں قرآن کی جانب اُٹھتی نہیں ہیں لہٰذا ان پر پیغمبروں کی عظمت اور انقلاب انگیزی کا راز منکشف ہو تو کیسے۔

[2] ان میں ہال مصنف بھی شامل ہے۔

کر گیا جوتی کے لیئے اُس نے بڑی سے بڑی قوّت سے ٹکرانے اور ہر قربانی دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ ایسا انسانیت نواز، شفیق، وحشیانہ پن سے بالکل پاک اور اُونچے ذہن والا فرعون مصر کو کبھی نصیب نہیں ہوا، دیانت وصداقت، سادگی، اخلاص و پاکیزگیٔ قلب کا عملی درس دے کر وہ سوا تین ہزار برس پہلے، انسانی زندگی کے اور بھی ایسے رُخ پیش کر گیا جن کی تقلید آج بھی کی جا سکتی ہے۔ اُس نے عملاً بتا دیا کہ شوہر کیا ہوتا ہے، باپ کے فرائض کیا ہیں، دیانت دار کو کیا لازم ہے، شاعر کو کیا محسوس کرنا چاہیئے۔ مبلغ کیا سکھلاتا ہے، فنکار کی راہیں کونسی ہیں، سائنس دان کا عقیدہ کیا ہونا چاہیئے اور ایک فلاسفر کا اندازِ فکر کیا ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ اس نے تخت پر بیٹھ کر کیا، ایسے ملک کے تخت پر جو دُنیا کا سب سے طاقت ور ملک تھا۔

یہ اُونچا انسان تا زیست اپنے زرّیں اصولوں پر کاربند رہ کر عالمگیر اخوّت و مساوات، امن و انسانیت اور وحدانیت کا عملی درس ایسے وقت دے گیا، جب دُنیا خونریزی اور فساد کے جنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ اور اس کا یہ پیغام ہی مصر کے پاس ایک ایسی متاعِ عزیز ہے جو ازمنۂ قدیم کے اُفق پر ماہتاب کی طرح درخشندہ و پائندہ ہے۔

نیچرل شاعری

بہتر ہو گا کہ اسے شاعر کی حیثیت سے جانچتے چلیں۔ نیچرل شاعری کا مکمل نمونہ دُنیا میں پہلے پہل

ہمیں اخناتون کے ہاں مل رہا ہے۔ وہ ایسے عالم کی سیر کراتا ہے جہاں کہیں تو سوسن کے پھول کھلے ہیں، کہیں "آفتابی نور" سے مخمور پھول نشہ میں جھوم رہے ہیں، پرندے پَر پھیلائے، خدا کی حمد کے گیت گانے مصروفِ پرواز ہیں، روشن دھوپ میں جانور محوِ رقص ہیں، روشنی کو خوش آمدید کہتی مچھلیاں دریاؤں میں اُچھلتی پھاندتی چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ شانِ خداوندی کے مختلف جلوے ہیں اور اس ظاہری دُنیا میں تجلّی خداوندی کی یہ ایسی مثال پیش کر گیا ہے جس کی نظیر سینکڑوں برس بعد جا کر زبور میں ملتی ہے یا موجودہ دور میں وڈز ورتھ اور اسی قسم کے دوسرے شاعروں نے پیش کی۔

وہ جو راستی پسند ہے

فرعون بننے کے بعد اُس نے اپنا ایک لقب رکھا "وہ جو راستی پسند ہے" اور یہ اس پر سو فی صدی صادق آتا بھی ہے۔ وہ دروغ یا تصنّع کے پاس بھی نہ پھٹکتا تھا اور ہر ہر مرحلہ پہ راست روی پر عمل پیرا رہا ہے اس کے سوا کوئی بھی فرعون اپنی خانگی اور پرائیویٹ زندگی کا صحیح رُخ عوام کے سامنے لانے کی جرأت کبھی بھی نہ کر سکا۔ ہر فرعون اپنے بُت خوبصورت اور شاندار بنوایا کرتا تھا۔ خود خواہ کتنا ہی کم رُو اور بدصُورت کیوں نہ رہا ہو۔ پھر یہ کہ فراعنہ حقیقی اور بیشتر فرضی کارہائے نمایاں اپنی یادگاروں میں جتلانا ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن اخناتون نے یہ تصنّع اور فریب کاری یکسر ختم کر کے رکھ دی۔ اپنا اور

محبّت، مسرّت و شادمانی، رنج و الم، غرض ہر رنگ، ہر روپ میں لوگوں کے سامنے آیا۔ جیسا خود تھا ویسے ہی بُت بنوائے۔ تمام بیٹیاں خصوصاً بیوی تو ہر موقعے پر ساتھ ہوتی تھی۔ مندر جاتے ہوئے رتھ میں ساتھ موجود، عوامی تقاریب میں اگر کسی کو خاص اعزاز سے نوازنا ہے تو تمغہ دیتے وقت خاوند کا ہاتھ بٹانے کو حاضر، غرض میاں بیوی کی باہمی غیر معمولی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ حتّٰی کہ ایک جگہ تو وہ شوہر عزیز کے گھٹنے پر بیٹھی نظر آتی ہے۔ میاں بیوی کی ایسی یکجائی کی مثال پوری مصری سنگتراشی کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔

اُس کے عجیب خدّ و خال

چہرے مہرے کے لحاظ سے اس کی شخصیت بڑی ہی غیر معمولی اور عجیب و غریب تھی۔ اُس کی کھوپڑی دُنیا کی ان چند سب سے بڑی انسانی کھوپڑیوں میں سے ہے جو اب تک مل سکی ہیں۔ بے رُو چہرہ، لمبی پتلی گردن، جُھکی پیشانی، طوطے کی سی ناک اور ملائم مُنہ، لمبی ٹھوڑی، بے حد پتلی ٹانگیں، فربہ پیڑو اور کمزور اعصاب۔ غرض اس میں مردانہ کرختگی نام کو نہ تھی۔ بھاری پلکوں سے ڈھکی آنکھوں میں گویا خوابوں کے سمندر موجزن تھے۔

اُس کے ڈھانچے کے طبّی معائنہ سے جو نتیجہ برآمد ہُوا وہ قدیم مشاہیر کی تاریخ میں اپنی نوعیّت کے لحاظ سے سب سے انوکھا، دلچسپ اور اہم

ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس کے جسم کا بے ڈھنگا تناسب، اکرمار اور خیالات کا نرالاپن اور بطور سیاست داں اس کی افسوسناک ناکامی یہ سب کچھ ایک مخصوص بیماری کی وجہ سے تھا جسے

کہتے ہیں — یہ بیماری اور اس کے نتائج اور اثرات صرف ایک آدمی کی ذات تک محدود رہ کر اس کی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوگئے بلکہ چودھویں صدی قبل مسیح میں شام، مصر اور عراق کی سیاسی حالت ہی نہیں بلکہ اہل فلسطین کے مذہبی تصورات اور ذہنی تشکیل اور ایک طرح سے مختلف ادوار پر اس صلح پسند اور شاعر صفت فرعون کے مرض کا نمایاں اثر پڑا۔ الیٹ سمتھ ( ) کے خیال میں:

"اگر یہ مرض نہ ہوتا تو پھر مشرقِ وسطیٰ اور سوڈان وغیرہ کی تاریخ اور لٹریچر کی نوعیت ہی مختلف ہوتی۔"[1]

اس کی افسوسناک ناکامی

وہ اپنے مذہبی انقلاب کے باعث پجاریوں اور عوام میں تو غیر مقبول تھا ہی اپنی امن پسندانہ اور کمزور پالیسی کے سبب فوجی افسروں میں بھی غیر مقبول ہوگیا۔ اس کی امن پسندانہ تبلیغی کوششوں کے باوجود اس کا مذہب عوامی نہ بن سکا کیونکہ خدا کے متعلق اس کا نظریہ گو ہمارے لئے اجنبی نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ

---

[1]

اور فلسفیانہ خیالات نہ صرف ان لوگوں کی فہم سے بالاتر ہے، بلکہ ان کے نزدیک ملحدانہ بھی۔ اور مصری یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کا اور ان کے محکوم ایشیائیوں اور افریقیوں کا خدا ایک ہی ہو بھی سکتا ہے۔ یہ لوگ اپنے قدیم رسم و رواج اور مذہبی عقائد میں کوئی بھی مداخلت برداشت نہ کر سکتے تھے۔ خواہ وہ پرامن ہی کیوں نہ ہو۔

پرامن ذرائع کے ذریعے عوامی اذہان سے ہزاروں برس کے عقائد کا رنگ چھڑا کر ان میں انقلاب لانے کے لیئے ایک عرصہ کی ضرورت تھی۔ اور اس کو اس مقصد کے لیئے صرف بارہ برس مل سکے۔ جن میں سے بیشتر مدت پجاریوں سے نمٹنے میں بسر ہو گئی۔ لوگ کچھ متاثر ہونے لگے تھے کہ آپ مر گیا اور ساتھ ہی وہ دبا ہوا غصہ اور آتشِ انتقام پوری قوت کے ساتھ بھڑک اٹھی جو اس کے خلاف کوتاہ اندیش پجاریوں اور ان کے ہم نواؤں کے دلوں میں بارہ برس سے سُلگ رہی تھی۔ انھوں نے بڑی بے دردی سے اس نیئے مذہب کا استیصال کیا اور اس میں اخناتون کے جانشین برابر کے شریک رہے۔ خصوصاً اس کے داماد توت آنخ آمن نے پجاریوں سے مل کر اس توحیدی مذہب کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جو کچھ اس دوران میں رونما ہوا وہ تاریخ کا المناک باب ہے اور اس طرح وہ سائنٹفک نظریئے صدیوں تک کے لیئے کچل کر رکھ دیئے گئے جن سے موجودہ دور میں پھر روشناس کرایا گیا۔ اکثر یادگاروں سے اخناتون کا نام مٹا کر "وہ قابلِ نفرت آدمی" لکھ دیا

توت آنخ آمن جس نے اخناتون کے مذہبی انقلاب کا استیصال کیا۔

گیا۔ اسے "ارتداد اور لادینی" سے ملوث کیا گیا۔ دراصل اس دانشور نے ایک ایسے دور میں جنم لیا جبکہ لوگ اس کے جدید اور بصیرت افروز نظریوں کو سمجھنے اور انہیں اپنا لینے کی صلاحیتوں سے قطعاً محروم، جہالت و ظلمت کے گرداب میں پھنسے رہنا پسند کرتے تھے۔

فنونِ لطیفہ میں انقلاب

آرٹ میں جس انقلاب کا بیج آمنحوطپ سوم کے زمانے میں بویا گیا۔ وہ اس کے نامور بیٹے اخناتون کے وقت میں پوری طرح بارآور ہو گیا اور یہی اس کے عہد کے آرٹ کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔

یہی وہ وقت تھا جب کہ آرٹ کو فطرت کے براہِ راست اور حقیقی مطالعہ کے لئے وقف کر دیا گیا۔ یہ فن ہر قسم کی کورانہ تقلید اور رواجی پابندیوں سے بالکل آزاد تھا۔ اُس نے اپنے تمام مصوّروں، سنگتراشوں اور مجسمہ سازوں کو وہی کچھ پیش کرنے کی ہدایت کی جو کچھ وہ دیکھیں۔ بہ الفاظِ دیگر وہ ہر فن پارے کو مبنی بر حقیقت اور اپنے نظریہ راست روی پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس دور کے فنکاروں نے سریع الحرکت جانوروں، پھولوں، پودوں کے جھنڈوں، دلدلوں میں چھلانگیں لگاتے ہوئے جنگلی سانڈوں اور اڑتے ہوئے پرندوں کو خاص طور پر موضوع بنایا اور حقیقت کا رنگ اس میں اس حد تک بھر دیا کہ قدیم آرٹ میں اس کا کہیں جواب نہیں۔ آرٹ کے ان نادر فن پاروں سے اس زمانے کا فن کار، مندروں، محلوں، فرنیچر اور

روزمرہ کے استعمال کی چیزوں تک کو سجا گیا۔ بہترین نمونے "طل العمرنہ" میں دیکھنے میں آسنے ہیں۔ جہاں کے فرش اور ستون ہر قسم کی مصوری سے پٹے پڑے ہیں۔ متعدد نقاشی کے نمونوں کو آج کل کے بہترین شہ پاروں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

اخناتون کا یہ آرٹ تاریخ کی اصطلاح میں "امرنہ آرٹ" کہلاتا ہے گویا اخناتون نہ صرف ایک نئے مذہب، اور نیچرل شاعری کا علم بردار ہے بلکہ ایک آرٹ کا بھی جو اپنی مخصوص لائن رکھتا ہے۔

اس کے عہد کی سیاسی اہمیت

اس کا ایک بہت بڑا مقصد تھا دنیا میں "امن" کی بقا ـــ اور اس مقصد کی خاطر اس نے بیرونی دنیا میں مصری وقار کو بھینٹ چڑھا دیا۔ تلوار اٹھا کر ایک کونے میں ڈال دی اور جب اس کے شامی کمانداروں نے فوجی کمک طلب کی تو فوج بھیجنے کی بجائے آتن کی شان میں ایک قصیدہ کہہ ڈالا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ فہیم و عقیل انسان یہ رمز سمجھ نہیں پایا تھا کہ قوموں کی زندگی کا راز صرف شمشیر میں مضمر ہے۔ فی الحقیقت اس کا زمانہ سیاسی لحاظ سے مصر کے حق میں سودمند ثابت نہ ہوا۔ بقول پروفیسر بریسٹڈ:

"ایک طاقتور حکمران کی ایسی شدید ضرورت کبھی کسی قوم کو لاحق نہیں ہوئی۔ جتنی کہ آمنحوطپ سوم کی موت کے بعد مصر کو ایک مضبوط

اخناتون کے زمانہ کا ایک فن پارہ

فرمانروا کی ضرورت تھی اور اس نازک موقعہ پر اس ملک کو، اس کے برعکس ایک نوعمر اور خوابوں کی دُنیا میں بسنے والا فرعون نصیب ہُوا — گو وہ دنیا کا سب سے پہلا مفکّر و فلسفی تھا لیکن وہ دشمنوں کے پیدا کردہ ان ناسازگار حالات پر قابو نہیں پا سکتا تھا جو اس وقت قوم کو درپیش تھے۔"

امن کا بہ علم بردار اور خونریزی سے گریز اں فرعون لوگوں کو ایسے وقت میں، دُور اندیشی، رواداری، شفقت اور امن پسندی کا درس دے رہا تھا، جب عسکری نقطۂ نگاہ سے مصر کو ایک اور توتمس یا رمسیس کی ضرورت تھی۔

اس کا اور اس کے جانشین توت آنخ آمن، دونوں کا کوئی چھبّیس سالہ دورِ حکومت تاریخ میں بے حد اہمیّت رکھتا ہے۔ شام و فلسطین میں مصر کی بالادستی محض نمائشی رہ گئی تھی اور روز بروز رو بہ انحطاط تھی، یہ وہ وقت تھا جب کہ جہاں گرد پہاڑی قبائل نے نئی چراگاہوں اور خوراک کی تلاش میں ایک بار پھر متمدّن دُنیا کو لرزا دیا تھا۔ یورپی اور یونانی تہذیب کا منبع یعنی کریٹ کی تہذیب ان کے ہاتھوں ابھی ابھی پامال ہو چکی تھی۔ بابلی تہذیب نے بھی قریب قریب اپنے دن پُورے کر لئے تھے۔ ان تینوں طاقتوں یعنی مصر، بابل اور کریٹ کا زوال حِتّیوں اور اشوریوں کے سامنے تگ و دو کی نئی راہیں کھول گیا۔ ہزاروں بادیہ پیما ہجینں، ایشیائے کوچک، فینیشیا،

اور مصر میں اپنے لئے مستقل ٹھکانے ڈھونڈ رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شام و فلسطین پر خبری، چڑھ دوڑے تھے۔

اس کے علاوہ یہ زمانہ الیٹ سمتھ کے خیال میں اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہے کہ اب مصری بالا دستی ایسے وقت ماند پڑی جبکہ حطیوں اور اشوریوں اور شامیوں کی نبرد آزمائیوں کے سبب وہ واقعات ظہور میں آ رہے تھے اور کچھ آنے ہی والے تھے جنھوں نے عہد نامۂ قدیم کو ایک مخصوص رنگ دے دیا ہے — اور ادھر آریہ قدیم پاکستانی تہذیب کو، پامال کر کے، یہاں اہم رول ادا کر رہے تھے۔ غرض اس وقت تاریخ کے اہم ترین عہد کی سحر طلوع ہو رہی تھی —

اس کے دور کی مشہور شخصیتیں یہ تھیں۔ اس کا وزیر اعظم رامس، مہا پجاری مری را، محلات کا نگران خوئی، پولیس کا افسر اعلیٰ امنحو تپہ سالار حورم حب، میر عمارت اور مجسمہ ساز بک، دودو اور توتی۔

موسیٰ اور فراعنہ موسیٰ

موسیٰؑ اور فراعنۂ موسیٰ

حضرت یوسفؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ ان لیڈروں کے سلسلے کی آخری کڑی تھے، جو مصری اسرائیلیوں میں پیدا ہوتے رہے۔ پیغمبری سے قطع نظر بھی آپ غیر معمولی صلاحیتوں، انقلابی اور سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے اس عظیم سیاست دان، مقنن اور راہنما کا یہی جاذب دکمال تھا کہ ان تھک مسلسل جد و جہد اور سخت کوششوں سے بالآخر وہ صدیوں کی اس غلام اور مغلوب قوم میں زندگی کی لہر دوڑانے میں کامیاب ہو گیا جو مسلسل غلامی کے شدائد سہتے سہتے تمام جوہر کھو چکی تھی۔ یہی جاذب اور اثر انگیز شخصیت تھی جس نے مختلف قبیلوں اور نسلوں کے لوگوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ 'فرعونیت' کا مہیا کردہ ہر طرح کا عیش و آرام قوم کی خاطر قربان کر دیا۔

مصر کی سات ہزار سالہ تاریخ میں آپؑ پہلے نامور انسان ہیں جنھوں نے وقت کی خوفناک اور مستبد حکومت سے ٹکر لی۔ قوم کو وہ آئین دیا جو بائبل کا پہلا قانون ہے اور جس کے تحت اسرائیلیوں نے پہلی بار زندگی بسر کی۔

آپ کے ہم عصر فراعنہ

حضرت موسیٰؑ نے دو فرعونوں کا زمانہ دیکھا، یعنی آپ پیدا ہوئے انیسویں خاندان کے

فرعون رعمسیس دوم (۱۳۰۰ / ۱۲۲۵ ق۔م) کے زمانے میں اور ہجرت کی اس کے بیٹے منفتاح کے دورِ حکومت میں۔ تاہم مصر میں آپؑ کی موجودگی اور وہاں سے ہجرت کے متعلق مندرجہ ذیل تین امکانی ادوار عام طور پر تسلیم کئے جاتے رہے ہیں ۔۔۔

(ا) ہائیکسوس کے اخراجِ مصر سے لے کر تھتمس سوم کی فتوحات ۔۔ یعنی ۱۵۵۷ ق۔م سے لے کر ۱۴۸۱ ق۔م تک۔

(ب) اٹھارھویں خاندان کے زوال سے سیتی اوّل اور رعمسیس دوم ۔۔۔ یعنی ۔۔۔ ۱۳۳۲ ق۔م سے ۱۳۰۰ ق۔م تک اور

(ج) انیسویں خاندان کے زوال ۔۔ یعنی ۱۲۰۰ ق م کے بعد

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سنہ ۱۹۵۰ء ایڈیشن) کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

"اخراجِ موسیٰؑ کی تاریخ ابھی تک وثوق سے مقرر نہیں کی جا سکی ہے۔ اگر بائبل کے بیانات پر یقین کر لیا جائے تو پھر رعمسیس دوم اور منفتاح کا زمانہ قرار پاتا ہے لیکن اس نظریہ کو قبول کرنے میں سخت دشواری یہ ہے کہ منفتاح کے ایک کتبہ میں اسرائیلیوں کو فلسطین میں پہلے ہی سے آباد دکھلایا گیا ہے اس طرح ہجرت انیسویں خاندان میں تو ہو نہیں سکتی نہ بہت سے علماء کے خیال میں طل العمرنہ کے خطوط میں جس 'خبری' قوم کا ذکر ہوا ہے وہ یہی یہودی ہیں، یا جن آوارہ قبیلوں نے اٹھارھویں خاندان کے زوال پر فلسطین پر حملہ کیا
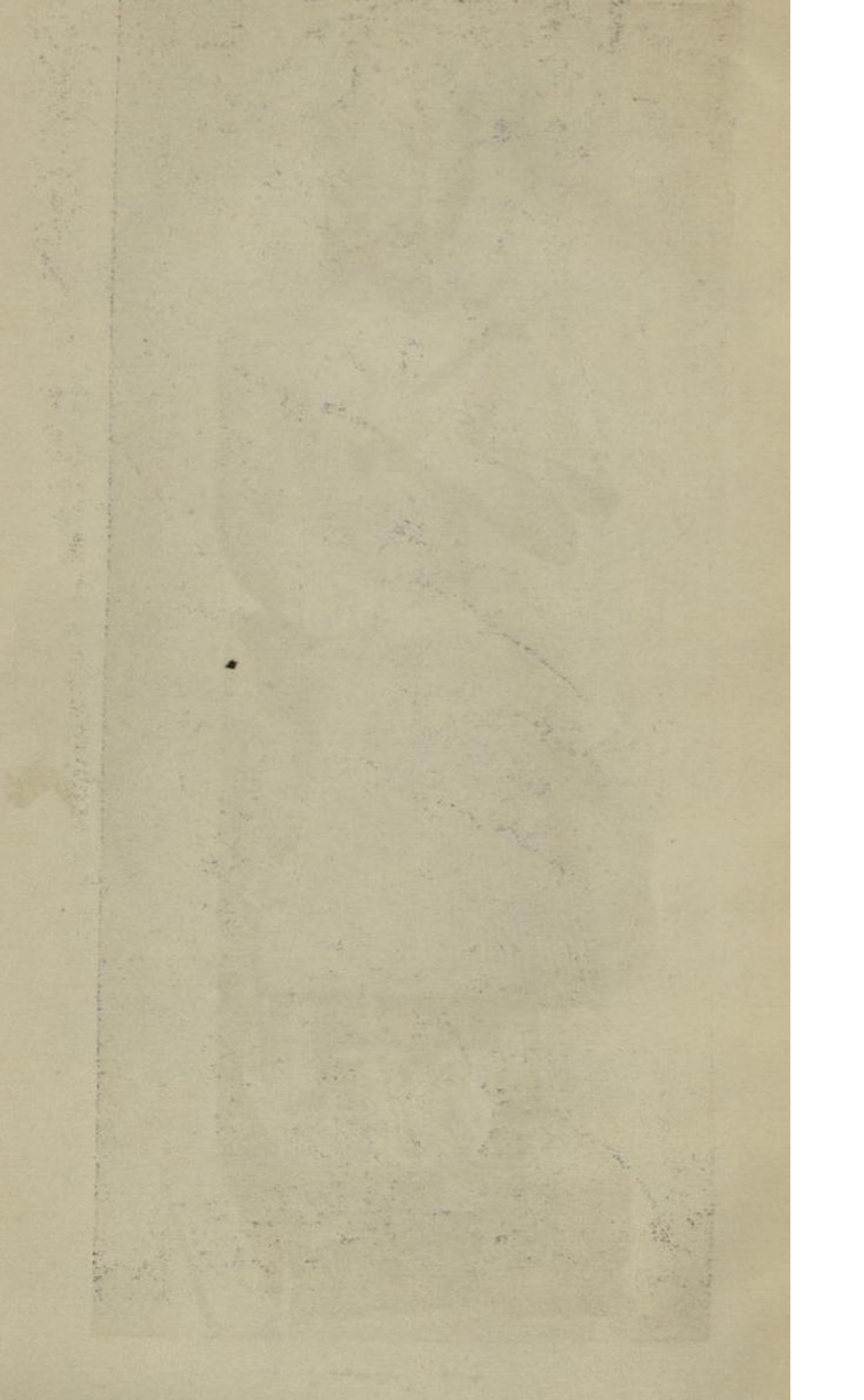
رعمسیس اعظم

جس کے محل میں حضرت موسیٰ کی پرورش ہوئی۔

وہ سارے کے سارے یا ان میں سے کچھ یہودی تھے۔ اس طرح خروج کا زمانہ تو تمتیس سوم کا عہد یا اس کے لگ بھگ کا وقت قرار پاجاتا ہے۔ گویا خروج کا بہت امکانی دور ۱۵۰۰ ق۔م ہے۔"
ڈونلڈ میکنزی
کے الفاظ میں:
"روایات کی رُو سے رعمیس دوم جابر فرعون تھا جس کے زمانے میں موسیٰؑ نے مصری علوم و حکمت سیکھے اور گفتار و کردار میں فرد ہو گئے۔ لیکن اگلا فرمانروا اسرائیلی ہجرت کا فرعون ہو نہیں سکتا کہ اس نے کوئی دس سال ہی حکومت کی اور اس کے کتبے سے معلوم یہ ہو رہا ہے کہ اسرائیلی اس وقت کنعان میں آباد تھے، اور مصریوں نے شام پر حملہ کیا تو اسرائیلی بھی ان کی زد میں آئے۔ طل العمرنہ[1] کے خطوط میں جس خبری قوم کا ذکر ہوا ہے وہ غالباً یہی 'حبری' یا 'عبرانی' تھے۔ یہ منفتاح سے کوئی دو صدیوں پہلے کی بات ہے۔ وہ 'حبرانی' اس وقت مصریوں کے حلیف کنعانیوں سے

---

[1] طل العمرنہ کے خطوط: تاریخ کی یہ مشہور اصطلاح ان خطوط کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو آمنحوطپ سوم، اخناتون اور ان کے ایشیائی حلیفوں، ان کے صوبہ داروں کے مابین آتے جاتے رہتے تھے۔ دورِ قدیم کا یہ نادر ورثہ اخناتون کے دارالحکومت آخت آتن (موجودہ طل العمرنہ) سے ہاتھ آیا ۱۸۸۷ء میں ان خطوں کی تعداد ۳۲۰ تھی لیکن اب ۳۶۰ کے قریب ہے۔

برسرِ پیکار رہتے۔ اس لئے اخراج یقیناً اٹھارھویں خاندان کے ابتدائی دور میں ہوا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ یہ زمانہ توتمس اول کا ہو۔"[1]

منفتاح کے ہم عصر اسرائیلیوں پر بحث تو آگے آئے گی لیکن میکنزی نے منفتاح کے زمانے میں ہجرت کی یہ دلیل نہایت ہی کمزور دی ہے کہ اس نے صرف "دس سال حکومت کی"۔ فاضل محقق اس مرحلہ پر یہ بات بھول گئے کہ رعمسیس نے سو سال کی عمر پائی اور کوئی چھتر برس حکومت کی چنانچہ اگر آپ رعمسیس کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے ہوں اور منفتاح کے زمانے میں ہجرت کی ہو تو اس میں تسلیم نہ کرنے کی کونسی بات ہے؟

ہال بھی ہجرت موسوی کو آمنحوطپ سوم سے پہلے تسلیم کر رہا ہے۔ غرض جو علماء حضرت موسیٰؑ کی ہجرت کو انیسویں خاندان کے فرعون منفتاح سے پہلے بلکہ بہت پہلے یعنی اٹھارہویں خاندان کے ابتدائی دور یا ہائیکسوس کے اخراج کے ساتھ ساتھ مانتے ہیں وہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر یہ خیال پیش کر رہے ہیں:

(ا) توتمس سوم کے کتبوں میں دو یہودی قبائل یعقوب ایل اور یوسف ایل کا ذکر ملتا ہے۔

(ب) اخناتون کے نام خطوط میں "خبری" نامی گروہ کی شام میں موجودگی

---

[1]

کا تذکرہ ہے۔

(ج) خود منفتاح کا وہ کتبہ جو فلنڈرس پیٹری نے ۱۸۹۲ء میں برآمد کیا۔

منفتاح کا یہ مشہور کتبہ اصلاً تو آمنحوطپ سوم کا تھا۔ لیکن منفتاح نے اس کے دوسری جانب عبارت کندہ کرا کے اسے مغربی ثیبہ میں نصب کرایا۔ منفتاح لکھتا ہے:

"بادشاہ سلام کہتے ہوئے جھک گئے ہیں۔ کوئی بھی سر نہیں اٹھا رہا۔ تھینو (لیبیا) پامال ہے اور ختا پُرسکون۔ سرزمین کنعان روند دی گئی۔ اہالیانِ عسقلان و جزر کو غلام بنا لیا۔ (شہر) 'انومیم' تسخیر ہو گیا۔ اسرائیلی نیست و نابود کر دیئے گئے۔ ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ 'خاکی' (فلسطین) مصر کے سامنے معذور اور بے آسرا بیوہ کی مانند ہو کر رہ گیا ہے۔ سب ملک اب متحد اور پُر امن ہیں۔ ہر باغی منفتاح کا حلقہ بگوش ہے۔"

مصر کے اثری انکشافات میں یہی کتبہ ہے جس میں پہلی بار اسرائیل کا نام باقاعدہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ بعض علما نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس کتبہ میں جن اسرائیلیوں کا ذکر ہے۔ یہ دراصل وہ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی سرکردگی میں منفتاح سے بہت پہلے نکل کھڑے ہوئے تھے اور منفتاح کے زمانے میں جب شام و فلسطین پر حملہ ہوا تو یہ وہاں آباد تھے۔

دوسرا مقبولِ عام اور درست خیال یہ ہے کہ ہجرت منفتاح کے زمانے میں ہوئی۔ مصر کے دو قدیم شہروں 'پتام' اور 'رعمسیس' ہیں نیوائیل

اور بیٹری نے علی الترتیب جو آثار کاوی کی اس سے

قطعی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ رعمسیس دوم ہی وہ فرعون ہے، جس نے غیر ملکیوں اور اسرائیلیوں پر باقاعدہ ستم رانیاں کیں۔ اُدھر ۱۹۲۶ء میں فلاڈلفیا یونیورسٹی کی اثریاتی مہم 'بیسن' واقع فلسطین سے رعمسیس دوم کا ایک ستون برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئی جس پر مرقوم ہے:

"فرعون (رعمسیس) نے سامی غلاموں سے (شہر) 'رعمسیس' کی تعمیر میں کام لیا ہے۔"

علاوہ ازیں ۱۸۶۴ء میں کباس نے رعمسیس ثانی

کے متعدد ایسے کتبے ڈھونڈ نکالے۔ جن پر 'اپوری' یا 'اپری' نام کے لوگوں کا تذکرہ اس طور پر کیا گیا تھا کہ یہ اپوری (اپری) غلام اینٹیں بنایا کرتے تھے۔ علماء نے ان سے مراد عبرانیوں (عبری۔عبرانی) سے لی ہے۔ حاصل مبحث یہ کہ رعمسیس دوم کے زمانے میں عبرانی یا اسرائیلی مصر میں موجود تھے۔

توتمس سوم کے عہد میں دو یہودی قبیلوں 'یعقوب ایل' اور 'یوسف ایل' کی شام میں موجودگی — اخناتون کے خطوط میں شامی علاقوں پر 'خبری' حملے اور منفتاح کے مذکورہ اہم کتبے کا جہاں تک سوال ہے، سو اس کے متعلق

تو یہ ہے کہ اسرائیلی قبائل در اصل مصر سے یکدم نہیں بلکہ مختلف اوقات میں نکلتے رہے۔ کچھ قبیلے تو ہائیکسوس کے ساتھ چلے گئے اور دوسری مکمل اور بڑی ہجرت حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوئی۔ بات اصل میں یوں ہے کہ سارے اسرائیلی[1] بیک وقت ہی مصر میں مقیم ہو کر نہیں رہ گئے تھے بلکہ ہوا یہ کہ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں کنعان جب قحط کی زد میں آیا تو اکثر اسرائیلی خوراک کی تلاش میں مصر چلے آئے اور جب قحط کا اثر ختم ہوا تو ان میں سے متعدد اپنی آبائی سرزمین کو لوٹ گئے۔ کچھ بعد میں ہائیکسوس کے ساتھ چلے گئے۔ اس طرح اسرائیلی گروہ بیک وقت شام میں بھی آباد تھے اور مصر میں بھی۔ پیٹری کے الفاظ میں:

> "اس وقت (منفتاح کے زمانے میں) اسرائیلی دو بڑے گروہوں میں منقسم تھے۔ ان میں سے ایک نیل کے کناروں پر آباد تھا اور لیبیا والوں کی جنگ کے وقت موجود تھا۔ دوسرا فلسطین میں رہتا تھا۔ اور 'حبرون' اور 'جزریل' کے درمیان آوارگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔۔"

لہٰذا تو تمس کے 'یعقوب ایل' اور 'یوسف ایل' اور اخناتون کے 'خبری'

---

[1] یہ سمجھنا غلطی ہو گی کہ اسرائیلی صرف وہی تھے جو حضرت یعقوبؑ کی نسل سے تھے بلکہ اسرائیلی وہ تمام لوگ تھے جو دینِ براہیمیؑ میں آچکے تھے۔

یہی فلسطینی یہودی تھے اور منفتاح نے اپنے کتبے میں جن اسرائیلیوں کا ذکر کیا ہے وہ بھی فلسطین کے یہی اسرائیلی تھے جو مصری یہودیوں کے ہم عصر اور فلسطین میں موجود تھے۔

بائبل میں اسرائیلی ہجرت کے جو واقعات درج ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ کم از کم دو ہجرتوں کے ہیں یعنی ایک ہجرت تو وہ جو اٹھارھویں خاندان کے بانی آحمس ۱۵۸۷/۱۵۶۲ ق۔م یا اس کے بیٹے آمنحوطپ اول ۱۵۶۲/۱۵۴۱ ق۔م کے زمانے میں ہوئی اور دوسری وہ جو حضرت موسیٰؑ نے منفتاح کے زمانے میں کی۔ بائبل کے وقائع نگار نے غلطی سے یہودیوں کی اس دو مرتبہ نقلِ مکانی کے واقعات اس طرح مربوط کر دیے کہ اب وہ بظاہر صرف ایک ہجرت کے معلوم ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ بائبل میں جو ابتدائی واقعات درج ہیں وہ در اصل بنی اسرائیل کے ان گروہوں سے متعلق ہیں جو قحطِ یوسفؑ کے اختتام اور پھر ہائیکسوس کے زوال کے بعد مصر سے ہجرت کر گئے تھے صرف ہجرتِ موسوی سے ہی متعلق نہیں ہیں۔ بائبل کا ایک فقرہ ہے۔

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسفؑ کو نہیں جانتا تھا"

خروج ۱/۸

یہاں نئے بادشاہ سے مراد تو آحمس (یا آمنحوطپ اول یا پھر تحتمس اول) سے ہی ہے لیکن جس فرعون نے شہر "پتام" اور "رعمسیس" کی تعمیر میں کام کیا وہ صرف رعمسیس ثانی ہی ہو سکتا ہے۔ بائبل کا وقائع نگار اس حد تک تو درست ہے

منفتاح (فراعنہ موسیٰ)
اس کے زمانے میں حضرت موسیٰ
نے ہجرت کی

منفتاح کے مقبرہ کا اندرونی منظر
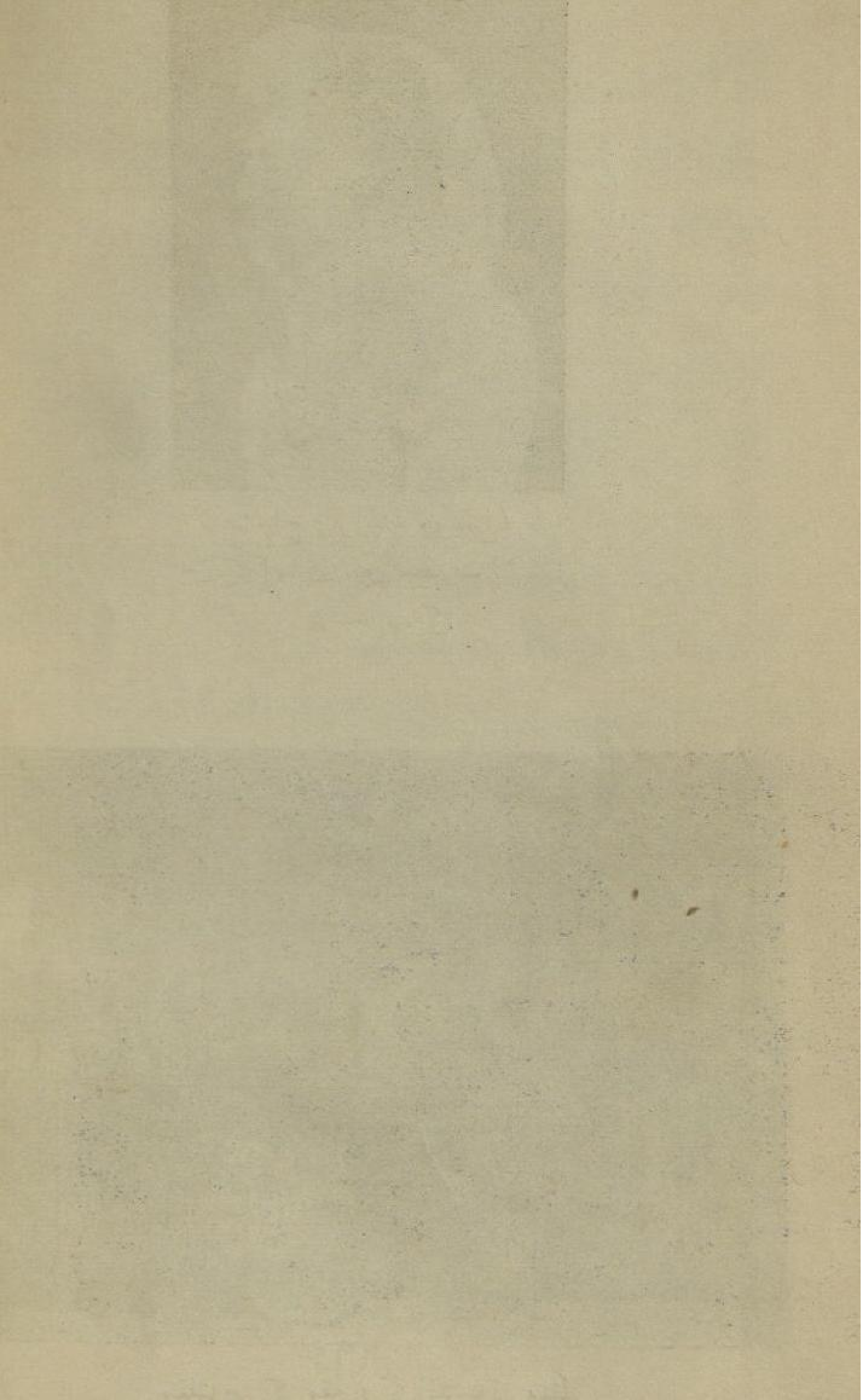
آحمس یا آمنحوطپ اوّل نے اسرائیلیوں پر سختیاں کیں لیکن اس نے یہ واضح نہیں کیا کہ آحمس کے قریباً تین صدیوں بعد رعمسیس ثانی کے زمانے میں ایک مرتبہ پھر ابتلا کا دور کیا اور اس طرح بائبل کے مصنف سے پہلی ہجرتِ موسیٰؑ بتلا کر واقعات کا رُخ کہیں سے کہیں موڑ دیا۔[۱]

اسرائیلی کون تھے؟

اس موقعہ پر یہ دیکھ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی راہنمائی میں جن لوگوں نے مصر سے ہجرت کی تھی، وہ سب اسرائیلی اور سامی تھے یا ان میں اور بھی ہیں شامل تھیں۔۔۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق صرف یہ غلط فہمی تھی کہ آپ صرف بنی اسرائیل یا مذہب ابراہیمؑ کو ماننے والوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ معتوب مہاجران تمام غیر ملکی اور خصوصاً ایشیائی اقوام پر مشتمل تھے جو مصر میں آباد تھیں اور یکساں طور پر مصریوں کی تختۂ ستم بنی ہوئی تھیں حتیٰ کہ ان میں آریہ تک موجود تھے۔ کیونکہ توتمس چہارم، آمنحوطپ سوم اور اخناتون

۱؎ پروفیسر ونکلر نے اس سلسلے میں ایک پُرلطف نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مصر کے متعلق جو بھی واقعات بائبل میں آئے ہیں وہ دراصل فرعونوں کے مصر سے نہیں بلکہ شمالی عرب میں واقع ایک مُلک 'مُصر' یا 'مُصری' سے متعلق ہیں اور حضرت موسیٰؑ نے اسرائیلیوں کو لے کر اسی 'مُصر' سے ہجرت کی تھی۔ ان کا یہ خیال پہلے خاصا مقبول ہو گیا تھا لیکن بریسٹڈ نے اپنی 'تاریخِ مصر' میں اس نظریہ کو غیر معقول ثابت کر دیا۔

کی بیویاں مُنت ایلیا، گل خیپا اور تادوخیپا وغیرہ عراق کی آریائی ریاست "متانی" کی شاہزادیاں تھیں اور مصر و متانی کے تعلقات عرصہ تک بڑے ہی دوستانہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ان خوش آئند تعلقات اور اپنی شاہزادیوں کی مراعات سے فائدہ اٹھا کر کتنے ہی آریہ مصر میں نہ آن بسے ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرداً فرداً ہر قوم کے مقابلے میں "اسرائیلی" شاید غالب تعداد میں ہوں ــــ لیکن دیگر اقوام بحیثیت مجموعی ممکن ہے کہ ان اسرائیلیوں سے زیادہ ہوں۔ اسرائیلیوں کو بالادستی اس لئے حاصل تھی کہ دیگر سامی اور آریائی قومیں صحیح لیڈرشپ اور بااثر طبقہ سے محروم تھیں اس کے برعکس "اسرائیلی" اس نعمت سے بہرہ مند تھے۔ اور چوں کہ دیگر کئی قومیں بھی دین براہیمی قبول کر کے ان کے ساتھ ساتھ شامل ہو گئی تھیں اس لئے یہ لوگ دوسروں پر غالب تھے۔ لیکن ساتھ ہی واقعہ "سامری" سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ کچھ عناصر ان تارکانِ وطن میں ایسے تھے جو حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کے غلبہ کو برداشت نہیں کر رہے تھے بلکہ جو گروہ سامری حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں بچھڑے کی پرستش پھیلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان کا رہنما اتنا بااثر اور قابل ضرور تھا کہ حضرت ہارونؑ کی موجودگی میں بھی وقتی طور پر وہ اپنا تاثر پھیلانے اور قائم کرنے میں کامران رہا۔

غرض ان مہاجرین میں اسرائیلی عرب، فنیقی، شامی، کنعانی، عراقی، آریہ اور اہلِ لیبیا سب ہی شامل تھے چوں کہ مصری سب ہی غیر ملکیوں سے متنفر تھے

اس لئے حضرت موسیٰ نے انھیں متحد کر کے اپنے یا بہ الفاظ دیگر اسرائیلی جھنڈے تلے جمع کر لیا اور ان میں آزادی کی روح پھونکی۔

بچپن حضرت موسیٰؑ کی والدہ یوکبد نے آپ کو شیر خوارگی کے عالم میں ہی دشمنوں کے خوف سے سپردِ نیل کر دیا — اور ساتھ ہی بیٹی کو تاکید کر دی کہ وہ ساتھ ساتھ چلتی جائے اور دیکھے کہ نومولود پر کیا گزرتی ہے۔

حضرت موسیٰ سے متعلق یہ پانی والی روایت اپنی قسم کی واحد نہیں ہے بلکہ اس سے ملتی جلتی حکائتیں مختلف قومیں اپنے سورماؤں سے منسوب کرتی آئی ہیں مثلاً سارغن اکادی، سری کرشن ہندی، سائرس ایرانی، پرسیس یونانی اور رومولو رومی — اس قسم کی سب سے پہلی حکایت ہمیں سومیر کے عربی النسل بادشاہ سارغن اوّل کے متعلق اس کی اپنی زبانی ملتی ہے:

"میں شارگینا — طاقتور بادشاہ — اکاد کا حکمران ہیں ہوں میری ماں اونچے گھرانے سے تھی۔ باپ کا مجھے علم نہیں۔ میرے باپ کے بھائی پہاڑوں میں رہتے تھے — میرا قصبہ ازی پرآنو تھا جو فرات کے کنارے ہے۔ ماں حاملہ ہوئی اور خفیہ طور پر مجھے جنم دیا — وہ مجھے شرو (نرسلوں) کی ٹوکری میں ڈال کر اس کا منہ رال سے بند کر کے دریا میں بہا گئی۔ دریا نے مجھے ڈبویا نہیں۔ دریا مجھے دور اکی پانی بھرنے والے کے پاس لے آیا — اکی پانی

بھرنے والے نے مجھے نکال لیا۔ اکیّ پانی بھرنے والے نے مجھے پالا پوسا اور پھر باغ کا رکھوالا بنا دیا۔ اسی دوران میں عشتار (دیوی) مجھ پر مہربان ہو گئی۔"

کچھ علماء مغرب کے خیال میں حضرت موسیٰؑ کے بچپن کی پانی سے متعلق حکایت سارغن والی روایت سے ہی ماخوذ ہے۔ عہد نامہ قدیم میں یہ قصہ اس طرح آگیا کہ بابل میں اپنے قیام اسیری کے دوران میں عزرانی نے سارغن والے قصے کو اس وقت سنا جب بنوکدنصر (بخت نصر) یہودیوں کو گرفتار کرکے بابل لے گیا تھا اور سننے کے بعد یہ واقعہ عزرانی نے حضرت موسیٰؑ سے منسوب کر دیا۔

سارغن کی حکایت کے اثرات بائبل نے قبول کئے ہوں یا نہ، اتنا البتہ مسلّم ہے کہ حضرت موسیٰؑ یقیناً سپردِ آب کر دیئے گئے تھے اور جب اسرائیلیوں اور دیگر غیر ملکیوں پر رعمسیس کے بے پناہ عتاب کے شواہد مل رہے ہیں تو پھر اس واقعہ کی صداقت اور اسے صحیح تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں رہتا۔

زوجۂ فرعون (آسیہ) اسی نوفرتھی

بہرحال رعمسیس کے گھرانے کی ایک عورت دریا پر آئی ہوئی تھی۔ اس نے جھاؤ میں پھنسا دیکھ کر بچے کو نکال لیا اور محل میں لے گئی۔ یہودی روایات کے مطابق خاتونِ مذکور فرعون کی بیٹی تھی لیکن جس عورت نے آپ کی پرورش

کی وہ فرعون کی بیوی تھی — یہودی مورخ جوزفس اس کا نام تھرموطس اور بروغش کے خیال میں یہ میرس نامی شاہزادی تھی جو رعمسیس کی بیٹی تھی۔ جان سائوتھ ورتھ کے الفاظ میں :

"موسیٰ کی پرورش (انیسویں خاندان کے فرعون) سیتی اوّل کی بیٹی نے ایک شاہزادے کی طرح کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موسیٰ کی ماں فرعون زادی تھیں اور والد عبرانی غلاموں میں سے تھے [1]"

اسلامی روایات کی رو سے اس عورت کا نام آسیہ یا اِسیہ تھا۔ قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ خاتونِ مذکور رعمسیس کی بیوی ہی ہوسکتی تھی بیٹی نہیں کیونکہ بالکل کمسن شاہزادی کا مادرانہ جذبات سے مجبور ہو کر بچے کو سخت گیر باپ کے عتاب سے بچا لینا محلِ نظر ہی ہے۔ رہا یہ امکان کہ آسیہ خود ہی فرعون زادی یعنی سیتی اوّل کی بیٹی ہو تو اس کا فی الحال کوئی اثری ثبوت نہیں مل سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی کتبہ اس کو سیتی کی بیٹی ثابت کر دے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ رعمسیس کی کوئی ملکہ آسیہ یا اِسیہ نامی تھی بھی —؟ مصری آثارِ قدیمہ سے بروغش نے اس کی چار قانونی بیگمات اِسی نُوفر، نُوفر وتارا نفریری اور مینمُت — اور فلنڈرس پیٹری نے اُست نفرت، نفرتری اور مُفر رو تین بیویوں کے نام ڈھونڈ نکالے ہیں۔ اوّل الذکر ملکہ اِسی نُوفر

---

[1]

اَیرت نفرت، رعمسیس کی سب سے محبوب بیوی تھی۔ اس کے چار بیٹوں اور ایک بیٹی کا پتہ یادگاروں سے چل رہا ہے اور اسی ملکہ کا نیک اور شریف النفس بیٹا خائمس، رعمسیس کے ۱۱۱ بیٹوں میں سب سے زیادہ ہونہار تھا۔

اب اس ملکہ کا نام قابلِ غور ہے۔ اتنا طویل عرصہ گزرنے پر اس کے نام کے پہلے حصے کا اِسی یا اَیرت کا ناگزیر لسانی تبدیلیوں کی بنا پر اِسیہ یا آسیہ بن جانا بالکل ممکنات میں سے ہے۔ رعمسیس کے جانشین منفتاح کے سوائے اسی نوفر کے بقیہ تینوں بیٹے خائمس وغیرہ نوعمری میں ہی مر گئے تھے۔ اور جب حضرت موسیٰ دریا سے نکالے گئے ہیں تو ملکہ کم از کم اپنے دو بیٹوں کی موت کا صدمہ اٹھا چکی تھی ــــ اسی لئے وہ اس کمسن بچے کو بچا لے گئی آسیہ اپنے بچوں کے ساتھ مختلف قدیم یادگاروں میں ملتی ہے

آپ کی پرورش محلات میں شاہی خاندان کے دیگر بچوں کے دوش بدوش ہوئی اور مصری مذاہب، طب، نجوم، طریقِ جہانبانی اور سپہ گری پر آپ نے مکمل عبور حاصل کر لیا۔ میکنزی کے خیال میں آپؑ کی تعلیم و تربیت "ہیلو پولس" میں ہوئی تھی[1]

---

[1] بائبل میں "ہیلیو پولیس" کا ذکر "اون" کے نام سے آیا ہے۔ یہ موجودہ مصری مقام "متریہ" کے قریب تھا۔ اس کے پاس ہی ایک درخت اور کنواں ہے جسے عیسائی اور مسلمان دونوں ہی متبرک مانتے ہیں۔ مقامی قبطی عیسائیوں اور مسلمانوں میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ جب حضرت مریمؑ اور یوسف نجار خورد سال حضرت عیسیٰؑ کو لے کر مصر آئے (بقیہ ۲۴۹ پر)

بعض ماہرین آپ کے حسب و نسب کے متعلق بھی عام نظریئے سے اختلاف رکھتے ہیں مثلاً ویپچ، رالنسن اور سگمنڈ فرائڈ اور ان کے ہم نوا آپ کو نہ صرف مصری الاصل ہی بتلا رہے ہیں بلکہ آپ کو مشہور موحد فرعون اخناتون کے مذہب کا پیرو کہا جاتا ہے اور یہ کہ موسیٰ نام کی دو ہستیاں تھیں —
اس نظریے کا لب لباب یہ ہے:

"مصری الاصل موسیٰ توحید کے اصل بانی فرعونِ مصر اخناتون کے مذہب کے پیرو تھے۔ موسیٰ قدیم مصری زبان کے لفظ میس یا موس سے نکلا ہے جس کے معنی بچے کے ہیں۔ موسیٰ کے نام کا پہلا حصہ بھلا دیا گیا۔ اخناتون کی موت کے بعد خلفشار رہا تو اس کے مذہب کا پیرو موسیٰ نامی ایک طاقتور مصری شاہزادہ، گورنر یا پروہت اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر یہودیوں کا سرغنہ بن گیا — بائبل دو مختلف افراد کو موسیٰ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنے والے موسیٰ ان موسیٰ سے بالکل الگ ہیں جو نیرو (یعنی شعیب) کے داماد اور یہوداہ میں واسطے کی حیثیت رکھتے تھے۔ پہلے موسیٰ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ختم ہو گئے۔ بعد ازاں اپنے سردار کے قتل پر پردہ ڈالنے کے لئے اسرائیلیوں نے دونوں کو ایک ہی

(بقیہ حاشیہ ۲۴۸) تو اس درخت کے نیچے قیام پذیر ہوئے اور رکنوئیں کے پانی سے مریم نے بیٹے کے کپڑے دھوئے تھے۔

شخصیت بنا کر، دونوں کے مذہب (توحید اور یہوواہ پرستی) مربوط کر دیئے[1]"

حضرت موسیٰ کے قتل کا خیال علماء کو دراصل بائبل کی اُن آیات سے پیدا ہوا۔

"ایک نبی کے وسیلہ خداوند اسرائیل کو مصر سے نکال لایا اور نبی کے ہی وسیلہ سے وہ محفوظ رہا۔ افرائیم نے بڑے سخت سخت غضب انگیز کام کیئے اس لیئے اس کا خون اسی کی گردن پر ہوگا اور اس کا خداوند اس کی ملامت اسی کے سر پر لائے گا۔"

ہوسیع 12/13-14-12

اس سے تو انکار نہیں کہ اخناتون نے توحید کی تعلیم دی تھی لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ آپ اس سے متاثر بھی تھے اور توحید کی تعلیم اسرائیلیوں کے نزدیک نئی تھی ہی کب، جبکہ متعدد پیغمبران کرام بنی اسرائیل کو توحید سے آشنا کرا چکے تھے۔ رہی یہ دلیل کہ چوں کہ موسیٰ[2] مصری لفظ "موس" سے نکلا ہے۔ اس لئے آپ مصری الاصل تھے۔ سو یہ دلیل کچھ بھی وزن نہیں رکھتی کیونکہ آپ نے پرورش ہی خالصتہً فرعونی اور مصری ماحول میں پائی تھی۔ اس لئے آپ کا نام بھی مصری ہی ہونا تھا۔ عبرانی نام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[1] بحوالہ "نگار" خدا نمبر، اور "ہسٹری آف دی ورلڈ" از ویچ صہ ۸۸

مدین کو ہجرت

شروع شروع میں آپ کے تعلقات رعمسیس سے بےحد خوشگوار تھے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کو مصری نوجوانوں کی کمان سونپ دیا کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں آپ کو ایک مرتبہ ایتھوپیا کی مہم پر جانا پڑا۔ وہاں کے مرکزی شہر سبا، یا مروٗ کی شاہزادی تاربس نے آپؑ کی وجاہت سے متاثر ہو کر شہر کے دروازے کھول دیئے اور آپؑ کے عقد میں آگئی۔

ادھر مصر میں آباد غیر ملکیوں کا مخصوص آزادی پسند عنصر رعمسیس کی سخت گرفت سے چھٹکارا پانے کے لئے خفیہ خفیہ برابر زمین ہموار کرنے کی فکر میں تھا۔ ایسے ہی لوگوں سے حضرت موسیٰؑ کو بھی اپنی اصلیت کا پتہ چل گیا۔ اور وہ اپنی قوم کی زبوں حالی پر متفکر رہنے لگے۔ اردگرد کا فرعونی ماحول قوم کی آزادی کے لئے، آپ کی جدوجہد میں بظاہر سخت مانع تھا لیکن آپؑ کی انقلابی روح ان مادی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لائی۔ اور دیگر غیر ملکی راہنماؤں سے رابطہ پیدا کر کے آپؑ بھی جدوجہد آزادی میں شریک کار ہو گئے۔ اسی اثنا میں وہ قبطی کے قتل والا ناگہانی واقعہ پیش آ گیا — یہ خیال کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف قبطی کے قتل کی وجہ سے آپؑ کو ہجرت کرنا پڑی محض ایک گمنام اور معمولی قبطی کے قتل کی بنا پر اپنی پسندیدہ شخصیت کو رعمسیس سزا دینے پر کسی صورت میں آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے اسباب دراصل بڑے گہرے مذہبی اور سیاسی تھے۔ قتل تو ہجرت کی فوری اور اضطراری وجہ تھی۔

مصری کے قتل کے ساتھ ہی آپؑ کا تمام نسبی راز آپ کے ہی کسی بھائی بند کی زبانی فاش ہو گیا اور رعمسیس کو اگر آپؑ کی سرگرمیوں اور حسب و نسب کے متعلق کچھ شبہ رہ بھی گیا تھا تو وہ اب رفع ہو گیا اور اس غیر متوقع واقع قتل کو ثبوت بنا کر آپؑ جیسی با اثر، مقبول اور مسحور کن شخصیت کو قانونی پابندیوں میں جکڑ لینا چاہا لیکن آپؑ صورتِ حال پہلے ہی بھانپ چکے تھے لہٰذا مصر سے نکلے اور مدین چلے آئے۔

مدین کی بستی دراصل مدیان یا مدین نامی ایک قبیلہ کے نام پر چلی آتی تھی۔ اس قبیلہ کا جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ کا مدین نامی ایک بیٹا تھا۔ جو آپؑ کی تیسری بیوی قطورہ کے بطن سے تھا۔ مذکورہ قبیلہ عرب کے شمال مغرب میں بحیرہ قلزم کے کنارے اس جگہ آباد تھا جو شام سے متصل حجاز کا آخری حصہ ہے۔ حجازی جب مصر، شام اور فلسطین کا رُخ کرتے تو یہ راہ میں پڑتا تھا۔ یہاں پہنچ کر حضرت موسیٰؑ نے حضرتِ شعیبؑ کی دختر صفورہ سے شادی کر لی۔ آپؑ ایک مدت تک عربی صحراؤں کی آزاد فضاؤں میں سانس لیتے رہے اور اس طرح آزادی، غیوری اور جدوجہد کی ان تمام اعلیٰ صفات سے اور بھی متصف ہو گئے جو ایک صحرا نشین کو پیدائشی طور پر ودیعت کی جاتی ہیں۔

لیکن یہاں پہنچ کر بھی آپ اپنی قوم کی حالتِ زار سے غافل ہو کر نہیں رہ گئے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ فلسطین میں آباد یہودیوں سے بھی آپؑ رابطہ

پیدا کر چکے ہوں — آپ بوڑھے رعمسیس کی موت کے منتظر تھے۔ مصر سے آپ کو برابر اطلاعات پہنچتی رہتی تھیں۔ جب آپ نے رعمسیس کی وفات کے متعلق سُن لیا تو فوراً مصر روانہ ہو گئے۔

رعمسیس ثانی اور بیدر مصر کا یہ ہیبت ناک اور عظیم فرعون چھتر برس کی حکومت کے بعد کوئی سنو سال کا ہو کر مرا۔ مصری اور افریقی خدوخال کے مالک اپنے باپ ستی اوّل کے برعکس رعمسیس کے نقوش غالب ایشیائی تھے جو اس کی سامی النسل ماں اسے دے گئی تھی۔ خوشنما خمیدہ ناک، خوبصورت دہانہ و پیشانی، چھوٹی نفیس ٹھوڑی، اور سوچتی ہوئی آنکھیں — جسمانی قوت و کردار باپ جیسا تو نہ پایا تھا لیکن تھا باپ سے زیادہ حسّاس، خوش طبع اور امن پسند۔ اس کا بیشتر زمانہ امن و سکون کا مظہر تھا۔ ۷۵ سالہ طویل دورِ حکومت میں اس نے اپنی تمام اہم جنگیں صرف ۱۲ سال کے عرصے میں لڑیں۔ وہ اپنے ساتھ دو پالتو شیر رکھتا تھا جو اس کے ساتھ جنگوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ گو وہ اپنی شہرت بحیثیت ایک جنگجو کے چھوڑ گیا ہے لیکن اس کے اصل کارنامے نظم وضبط اور امن وامان کی بقا، نہروں اور عمارتوں کی تعمیر پر مشتمل ہیں۔ اس نے مصر کی مشرقی سمت میں ایک طویل حفاظتی دیوار تعمیر کی اور نیل اور بحیرہ احمر کو ایک نہر کے ذریعے سے ملا دیا۔ ان کے علاوہ اس نے بے شمار عمارتیں، مینار اور دیوپیکر مجسمے بنا کر مصر کے کونے کونے کو زینت بخشی۔ یہ عظیم سیاستدان اور جرنیل عیش وعشرت کا

بہت دلدادہ تھا۔ اس کے حرم میں بے شمار خوبرو عورتیں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کثیر الاولاد یعنی ۱۱۱ بیٹوں اور ۵۱ بیٹیوں کا باپ تھا۔

منفتاح کا ناسازگار دور

حضرت موسیٰؑ مدین سے لوٹے تو لائق باپ کے نااہل بیٹے منفتاح کا زمانہ تھا اور مصر اندرونی و بیرونی گرداب میں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔

یہ رعمسیس اعظم کا تیرھواں بیٹا تھا اور اپنے نیک نام بھائی خامس کی موت کے بعد ، ۴۰ سال کی عمر میں ولی عہد مقرر ہوا۔ بڑی بڑی خمار آلود آنکھیں، خمیدہ ناک، اُوپر کا ہونٹ بہت پتلا، چوڑے گال اور گول ٹھوڑی، بحیثیت مجموعی اس کے خدوخال بڑے ملائم اور نسائی تھے۔ حد درجہ متلوّن مزاج، کم حوصلہ، ظالم اور مکار تھا۔ نہ تو اچھا سپاہی تھا اور نہ ہی عمدہ سیاست دان۔ افسوں گری اور باطل پرستی کی طرف مبالغہ کی حد تک مائل تھا۔

اٹھاون برس کی عمر میں ہوطسپ حی ما منفتاح ثانی کے لقب سے فرعون بنا۔ اُس نے آٹھ یا زیادہ سے زیادہ دس سال حکومت کی اور ابتدائی سال بڑے ہی ناسازگار تھے۔ ایک طرف لیبیا والوں نے حملہ کر دیا۔ دوسری طرف شام میں بغاوت ہو گئی اور اس کے اپنے ملک میں تخت کا ایک مدّعی اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر حضرت موسیٰؑ نے منفتاح کی مستبد حکومت کے خلاف عملی طور پر حصّہ لینا شروع کر دیا۔

اس سیاسی انتشار اور بغاوتوں کے لحاظ سے اس دور کو ہم پاک و ہند کے عالمگیری دور سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ اورنگ زیب کی طرح منفتاح کا تمام زمانہ پریشانیوں اور شورشوں پر قابو پانے کی نذر ہو گیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ عالم گیر کو جو وقتی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان میں اس کی اپنی اہلیت کو دخل تھا جبکہ منفتاح کی کامرانیاں محض اتفاقی اور دوسروں کے زورِ بازو کا نتیجہ تھیں۔

رعمسیس کی موت کے بعد ہی فلسطینی قبائل نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے مصری بالادستی کے خلاف بغاوت کر دی اس بغاوت کے اصل محرک مصری اسرائیلیوں کے بھائی بند فلسطینی یہودی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے اشارے پر ہوئی ہو۔ منفتاح کو اپنی حکومت کے تیسرے ہی برس اس طرف سنجیدگی سے توجہ کرنا پڑی مصریوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کو بُری مار پڑی۔

اس کے دو سال بعد منفتاح اور مصر کو ایک اور عظیم مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مصیبت لبیا والوں کی لائی ہوئی تھی۔ رعمسیس اعظم کی موت سے ذرا ہی پہلے لبیا والے مصریوں سے شکست کھا کر بھاگ گئے تھے۔ اس مرتبہ پھر یہ چالیس ہزار، تیر کمان، تلوار اور رتھوں سے مسلح ہو کر بڑی تیاریوں کے بعد آئے تھے اور ہائیکسوس کی طرح ان کا ارادہ مصر ہی میں بس جانے کا تھا۔ ان اتحادیوں کا سالارِ اعظم مرمئو بن دثید تھا۔ ان میں چار قومیں

افریقی قبائل (۱) لُوبُو (اہلِ لیبیا) (۲) تہنیو (۳) ماشوش (۴) کاہاکا'
— ان کے علاوہ پانچ قبیلے یہ تھے :

(۱) اقیے واشا یا اکاوشا — یہ قبیلہ یُونانی تھا۔
(۲) طرشا — یہ قبیلہ اٹلی یا ایشیائے کوچک سے آیا تھا۔
(۳) 'لوکا' یا 'لُوکو'
(۴) شاردینا یا شارتانا — یہ بھی ایشیائے کوچک سے آیا تھا
(۵) شکالشا یا شِکلُوشا —

حملہ اتنا خوفناک اور بھرپور تھا کہ پُورا مصر لرز اُٹھا — ایک قدیم مصری کاتب کے الفاظ میں "اتنا نقصان تو ہائیکسوس نے بھی نہیں کیا تھا۔"
ادھر تو یہ حملہ آور تباہی مچا رہے تھے اور ادھر منفتاح نہایت اطمینان سے ممفس کے بند دروازوں کے پیچھے چُھپا، شہروں کی فصیلیں دُرست کراتا رہا — بالآخر محبِ وطن اور دلیر مصری کمانداروں نے مُلک کے ہر گوشے سے فوجیں جمع کر لیں، ان کے علاوہ منفتاح نے ایشیا سے بھی بھاڑے کے سپاہی منگا بھیجے۔

سب تیاریاں کر کے خلافِ توقع بڑی ہی ہمت سے کام لے کر منفتاح نے دشمن کے مقابلے میں بنفسِ نفیس نکلنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ بہانا نترا شا کہ دیوتا فتاح نے خواب میں مجھے محاذ پر جانے سے منع کرتے ہوئے کہا ہے :

"وہیں ٹھہر جا، جہاں کہ تو ہے — اپنی فوجوں کو آگے بڑھنے دے۔"
لہٰذا فرمانبردار فرعون ممفنس کی محفوظ دیواروں کے پیچھے سے نہیں نکلا۔
۳ رابیعنی (۸ ارمئی) کو حبّ الوطنی سے سرشار مصریوں نے ایک خوفناک جنگ کے بعد "پرسوپس" کے مقام پر لیبیا والوں کو فیصلہ کن شکست دی اور منفتاح نے اتحادیوں کے سرداروں کو بزدلی جیسے القاب سے نوازا۔ یہی نہیں بلکہ باوجود اپنی دوں ہمتی اور میدانِ جنگ سے غیر حاضری کے بڑی ہی ڈھٹائی اور مکاری سے کام لے کر اس عظیم الشان فتح کا سہرا اپنے سر باندھ لیا اور مخصوص فرعونی شان و شوکت کے ساتھ اپنا جلوس نکالا۔ لکھتا ہے:

"لوبو مصر میں شرارتیں کر رہے تھے۔ وہ گھاس کی ٹڈیوں کی طرح بے شمار تھے اور تب میں نے ان کی گوشمالی کی ٹھان لی۔ میں نے انھیں بری طرح مارا اور ان کے ملک کو روند دیا۔"

مطالبۂ آزادی

منفتاح کی قسمت میں سکون سے بیٹھنا لکھا ہی نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ جب سے مصر لوٹے تھے۔ غیر ملکیوں کو برابر منظم کرتے چلے آرہے تھے اور منفتاح کی حکومت کے چھٹے ساتویں برس آپ مقبولیت کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ چونکہ آپ کی پرورش منفتاح اور دیگر خاندانِ شاہی کے افراد کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس لئے شاہی خاندان اور اس کے تمام کمزور گوشوں سے آگاہ تھے۔ لہٰذا آپ نے پہلے تو منفتاح کی مستبد حکومت کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن جب یہ کوتاہ بین فرعون کسی طرح

بھی راست روی اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو آپؑ نے مطالبۂ آزادی پیش کر دیا اور لیبیا والوں کی شکست کے بعد تو یہ مطالبہ بہت ہی زور پکڑ گیا۔

گو منفتاح کافی کمزور پڑ چکا تھا۔ تاہم وہ غیر ملکیوں کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اجازت دیتا بھی کیسے جبکہ ان لوگوں سے مصریوں خصوصاً اونچے طبقے کو ہر امکانی آرام و آسائش پہنچ رہی تھی۔ اس موقعہ پر مذہبی روایات میں جن آفاتِ سماوی کا تذکرہ ہے بعض اذہان انھیں قابل قبول نہیں سمجھتے — حالانکہ بنیادی طور پر وہ نہ تو خلافِ معمول ہی تھیں اور نہ خلافِ عقل — اور مصری ان سے بالکل غیر مانوس بھی نہ تھے — البتہ مشیّتِ ایزدی کے تابع ان کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ تنبیہہ منظور تھی۔

چھوٹے پیمانے پر یہی سلسلہ مصر میں اب بھی جاری رہتا ہے — نیل کا پانی سُرخ اور مضرِ صحت آج بھی ہوتا ہے۔ طغیانی سے ذرا پہلے نیل میں پانی کی سطح انتہائی نیچی ہوا کرتی ہے جس کے سبب پانی قریباً ساکن اور ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ یہی وقت ہے جب مچھلیاں مرنے لگتی ہیں اور لاتعداد حشرات الارض کی وجہ سے پانی کی رنگت سُرخی مائل ہو جاتی ہے۔ ابتدائے جون کے اس موقعہ پر مصریوں کا انحصار کنوؤں اور حوضوں پر رہ جاتا ہے — بینڈک طغیانی کے بعد جولائی میں اُبل پڑتے ہیں — مچھر، جوئیں اور پھوڑے پھنسیاں سخت گرمیوں اور غیر صحت بخش مرطوب موسم خزاں کا عطیہ تھیں — ژالہ اور

بارش کی آفت جنوری میں آئی تھی، جبکہ جو کی بالیں نکل چکی تھیں اور گیہوں یا تو سرے سے نکلا نہ تھا یا پھوٹنے ہی والا تھا ــــ ہری بھری فصلوں پر ٹڈی دل موسم بہار (قریباً فروری) میں آن گرے تھے۔ مارچ کی گرم ہوائیں تیرہ و تار آندھیاں لائیں ــ اور آخری عذاب یہ کہ منفتاح کا بڑا بیٹا مر گیا۔ بقول رالنسن سوگ کا ذکر ایک کتبے میں موجود ہے۔

اس صورتِ حال سے گھبرا کر منفتاح حضرت موسیٰؑ کو چلے جانے کی فوری اجازت دینے پر آمادہ ہو گیا ــــ اس طرح تاریخ قدیم کا یہ نامور ہیرو مصر سے قریباً تمام اسرائیلیوں اور بیشتر غیر ملکیوں کو اپنی رہنمائی میں لے چلا۔ حضرت موسیٰؑ کی اس ہجرت کا صحیح سنہ تو تاحال معلوم نہیں کیا جا سکا۔ اور یوں کہنے کو ڈیوڈسن نے سنہ تو سنہ ہجرت کا مہینہ، تاریخ اور وقت تک بتلا دیا ہے۔ اس کے خیال میں اسرائیلی شہر رعمسیس سے ہفتہ کے چھٹے دن اور مصری مہینے نیسان کی ۱۵ تاریخ یعنی ۴ اپریل ۱۴۸۶ ق۔م کو آدھی رات کے وقت نکلے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ منفتاح نے ۱۲۲۵ ق۔م تک حکومت کی ہے۔ لہٰذا ہجرت اسی مدت کے درمیان ہوئی۔ پیٹری نے اس جگہ کی نشان دہی کی ہے جہاں سے کہ حضرت موسیٰؑ نے سمندر کو پار کیا تھا۔ اب وہاں خشکی ہے اور یہ جگہ سب سے اونچی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب یہاں پانی تھا تو یہ سب سے کم گہری ہو گی۔ یہیں کہیں منفتاح بھی غرق ہوا ــــ منفتاح کی غرقابی کے متعلق بھی مختلف آراء

ہیں۔ بعض لوگ تو سرے سے اس امر کے ہی منکر ہیں کہ کوئی فرعون ڈوبا بھی تھا؟ — جی۔ رالکنسن وغیرہ کے ساتھ ساتھ پاک و ہند کے بھی بعض علماء منفتاح کی غرقابی کو اس طرح تسلیم نہیں کرتے جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ گزرے تو پانی اُترا ہوا تھا اور منفتاح وہاں آیا تو پانی پھر سے چڑھ گیا — یعنی یہ سب سمندر کے مدّ و جزر کی وجہ سے ہوا تھا — اس میں کسی معجزہ کا دخل نہیں تھا۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر ہم دورِ موسوی کے مذہبی، معاشرتی اور علمی حالات کا جائزہ نہ لیتے چلیں۔ جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے اس میں تو خیر کوئی شبہ نہیں کہ قریباً پورا مصر اور حکمران طبقہ اصنام پرستی اور شخصیت پرستی کے طوفان میں غرق تھا — لیکن اس کے باوجود بعض مخصوص اور اونچے اذہان وحدانیت کے قائل تھے۔

ہامان

"آمن" (دیوتا) کے پجاری اب اتنے خودسر اور مضبوط و مقتدر ہو گئے کہ ایک طرح سے ملک کو وہی کنٹرول کر رہے تھے اور منفتاح بھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کر پاتا تھا۔ آمن کے اس پورے فرقے کا مہا پجاری لوئی تھا۔ یہ معبودِ اعظم آمن کے خزانوں کا محافظ بھی تھا اور منفتاح کا میرِ عمارت بھی — یہ شخص اپنے زمانے کی اہم ترین ہستیوں میں سے تھا۔ روایتوں میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جس ہامان

کا ذکر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی توئی ہو۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہامان سے مراد دراصل ''آمن'' کے کاہن اعظم سے ہے۔

منفتاح کے زمانے میں چونکہ مصر کی بالادستی ممالک غیر میں قریب قریب ختم ہو چلی تھی۔ اس لیئے بیرونی مقبوضات سے دولت بہت کم آرہی تھی۔ اس لیئے مندروں کے اونچے معیار کو برقرار رکھنے کا ایک اچھا خاصا پریشان کن مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ لہٰذا باہر سے جو کچھ بھی خراج آتا اس کا بیشتر حصہ مندروں کی نذر ہو جاتا تھا۔۔۔ ادھر پجاریوں نے ملک کی سب کانیں اور بیشتر زمینیں رفتہ رفتہ ہتھیا لیں اور جلد ہی وہ زمانہ آگیا کہ عام آدمی مذہبی رسوم بجا لانے کے قابل ہی نہیں رہ گیا۔ اس لیئے کہ پجاریوں اور دیوتاؤں کی نذر کرنے کو اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ صرف اونچے لوگ ہی مذہبی رسوم کی بجا آوری کر سکتے تھے۔ جب یہ صورتِ حال پیش آئی تو پھر لوگوں نے ہر امکانی چیز کو معبود بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔۔۔ اس طرح متعدد شجر و حجر، حیوان اور پچھلے وقتوں کے عظیم فراعنہ ''خدا'' بن بیٹھے۔

اس عظیم طبقاتی فرق کے باعث غریب مصری، فرعون، امیروں اور پجاریوں کے شکنجہ میں بُری طرح پسنے لگا۔ سیاسی طور پر مصر کا زوال اب واضح طور پر آچکا تھا۔ اس کے باوجود منفتاح اور ملک کا اعلیٰ طبقہ بڑی تعیش آمیز زندگی بسر کر رہا تھا۔۔۔ قریباً تمام اناج کھیتوں سے اٹھ کر مندروں اور سرکاری اناج گوداموں میں پہنچ جاتا اور عام مصری مشکل گزر اوقات کر پاتا تھا۔

اس پُرآشوب اور تاریک دور کے اُفق پر متعدد پاکیزہ ذوق بچاریوں اور دیگر مصری علماء کی علمی اور ادبی سرگرمی درخشاں ستارے کی مانند چمکتی نظر آرہی ہے۔ باقاعدہ درسگاہوں کے علاوہ بڑے بڑے مندر بھی ان علمی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ تاریخ، فلسفہ، الٰہیات، تصوّف، فلکیات، طب، ریاضی، نظم و نثر اور قصص و مسائل میں قابلِ قدر کام ہوا۔ حضرت موسیٰ کے ہم عصر مندرجہ ذیل چند وہ مایہ ناز اور صاحبِ کمال لوگ ہیں جو مندر دل خانقاہوں اور درس گاہوں میں شمع علم فروزاں کئے ہوئے تھے:۔

قاگابو، خوئے، بکین پتاح، آمن ناشو، نفرتپاح، پاان لبس،
آمن آم پی، اناّ، مرآم اپط، خورع، سُعن رو،
آمن آن انط — یہ شخص ثیبہ کی لائبریری کا ناظمِ اعلیٰ تھا۔
پنطور — اُس نے رعمسیس دوم کے کارناموں کو نظم کیا تھا۔

(محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور)

کتابیات

۱ - بائبل (اُردو) ۱۹۵۱ء

۲ - ترجمان القرآن دوم ——— مولانا آزاد

۳ - تفسیرِ ماجدی اوّل ——— مولانا عبدالماجد دریابادی

۴ - معارف القرآن ——— غلام احمد پرویز

۵ - تفہیم القرآن ——— مولانا مودودی

۶ - قصص القرآن اوّل ——— مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

۷ - رامائن (اُردو) ———

۸ - ارض القرآن اوّل ۱۹۴۴ء ——— سیّد سلیمان ندوی

۹ - تواریخ بائبل (اُردو ترجمہ) ——— ڈاکٹر بلیکی

۱۰ - تاریخ اقوامِ عالم ۱۹۵۰ء ——— مرتضیٰ احمد

۱۱ - تاریخ ملل قدیمہ ۱۹۲۱ء ——— از سنوکیس مترجم محمود اعظم

۱۲ - تاریخ فرعون ۱۹۵۰ء ——— حسن نظامی

۱۳ - علم الاقوام اوّل و دوم ۱۹۴۱ء ——— از بیرن فیلیسی مترجم سیّد عابد حسین

۱۴ - ویدک ہند ۱۹۲۱ء ——— میڈیم زینیڈے اے۔ راگوزن۔ مترجم حمید احمد انصاری